قند اُردو

QAND-I-URDU

REVISED EDITION

FOR

High School Examination, 1926, U. P. and Matriculation Examination 1926 of the Punjab Province, Lahore.

BY

Allahabad:

PRINTED AT AND PUBLISHED BY THE

Anwar Ahmadi Press.

1st *Edition* 500] **1923.** [*Price*

ترمیم شدہ

قند اردو
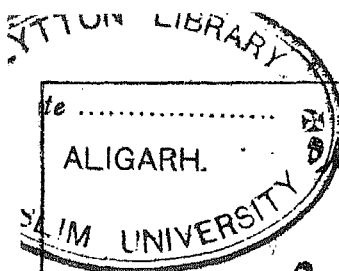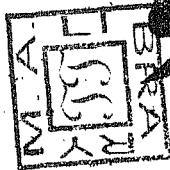
مؤلفہ

جناب مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری زینبی

مدرس عربی و فارسی گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الٰہ آباد

رکن انجمن ترقی اردو حیدر آباد دکن

منشی محمد اسمٰعیل صاحب مینیجر کے اہتمام سے

مطبع انوار احمدی الٰہ آباد میں طبع ہوا

ل ۵۰۰ (تمام حقوق محفوظ ہیں) قیمت فی جلد

ناظرین باتمکین

میں نے ۱۹۱۶ء میں یہ انتخاب مٹریکولیشن کے لئے تیار کیا تھا جس کو ممبران الٰہ آباد یونی ورسٹی اور پنجاب یونی ورسٹی اور مسلم یونی ورسٹی وغیرہ نے پسند فرمایا میں اُن حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چونکہ اس کے بعض مضامین پنجاب یونی ورسٹی کے نصاب اُردو میں بھی موجود تھے اِس لئے میں نے امسال اِس میں ترمیم کی۔ سرسید کا ایک مضمون نکال کر دوسرا اُس کے بجائے رکھ دیا اور مولوی عبدالحلیم شرر کے کل مضامین نکال کر اُس سے بہتر اور مضامین اضافہ کردئے۔ اور ڈاکٹر اقبال کی دو اور بہتہ نظمیں اضافہ کردیں۔ اب مجھے اُمید ہے کہ یہ انتخاب پنجاب یونی ورسٹی کے لئے بھی پہلے سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اور ہائی اسکول اگزامنیشن کے لئے بھی ممبران انٹرمیڈیٹ بورڈ الٰہ آباد اس کو پسند فرمائینگے۔

ناچیز مؤلف

فہرستِ مضامینِ قندِ اُردو

نثر

نظم

معذّر ناظرین

آجکل اُردو زبان کے جس قدر انتخابات مٹریکولیشن اور ہائی اسکول
اگزامنیشن میں جاری ہیں اُن کو دیکھکر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اِن
کلاسوں کے لئے ایک ایسا انتخاب ہونا چاہیئے جس سے طلبا کے
سامنے اُردو زبان کی ابتدا سے آجتک کے تغیّرات کا ایک نقشہ
کھنچ جاسے اور مضامین ایسے دلچسپ ہوں کہ طلبا اُس کو شوق
سے پڑھیں اور نیچے کے درجوں سے کسی قدر مشکل ہوں جس سے اُن کی
استعدادوں میں ترقی ہو اور اس قدر کلام کا انتخاب لیا جاسے جو
دو سال کی تعلیم کے لئے کافی ہو۔ لہذا تمام باتوں کا خیال کرکے یہ
انتخاب تیّار کیا گیا۔

اِس میں پہلے میر امن دہلوی اور سرور لکھنوی کے کلام
سے تھوڑا تھوڑا انتخاب اس غرض سے کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم
ہوجاسے کہ ابتدا میں دہلی اور لکھنؤ کی تحریر کا کیا رنگ تھا۔ اس کے
بعد اور لوگوں کے کلام کا انتخاب رکھا گیا ہے۔ اِس کی ترتیب میں
تقدیم و تاخیر مصنفین کے سنہ وفات کے اعتبار سے کی گئی۔ غالب
سب سے اوّل وہ شخص ہیں جنھوں نے انشا پردازی کا رنگ پلٹا۔
سرسیّد نے اُردو نثر کو قدیم شاہراہ سے پھیرکر سادگی پیدا کردی۔ اور
اُردو زبان میں مضمون نویسی اور لکچر وغیرہ کی راہ کھول دی۔ اور
اُردو زبان کی ترقی اور اس کی بقا کے لئے کوئی امکانی تدبیر اُٹھا نہیں

رکھی۔ آزاد کا کوئی خاص رنگ نثر میں نہیں ہے۔ مگر اُن کو
اُردو نثر لکھنے میں ایسی کامل قدرت تھی کہ رنگین اور سادہ۔
آسان اور مشکل۔ ہر طرح کی عبارت لکھ سکتے تھے اور جس رنگ
کی عبارت لکھتے تھے دل آویز ہوتی تھی۔ حالی اگرچہ نثر میں کسی
خاص طرز کے موجد نہیں مگر ان کا رنگ تحریر سرسید اور آزاد کے
بعد سب پہ فوق لے گیا۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کا کلام دہلی
کی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ شرر ناول اور خیالی مضامین یا
مناظرِ قدرت یا کسی سین کے عمدہ پیرایے میں ادا کرنے کے
بادشاہ ہیں۔ شبلی نعمانی کا طرز تحریر سادہ ہے اور اس قدر
دل آویز کہ قابل رشک ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار جدید طرز
ظرافت دلپسی کے موجد ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ کی زبان میں اگرچہ
کوئی خاص بات نہیں مگر سادگی اور بیساختہ پن اور ظرافت کا
چٹخارا زیادہ ہے اور جس قدر اردو زبان میں ان کی تصنیفات ہیں
کسی اور کی نہوں گی۔ منشی غلام غوث بیخبر غالب کے ہمعصر تھے
اُن کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ شستہ رنگین عبارت لاجواب لکھتے
ہیں۔ مولوی عبد الرشید صاحب نے زندگی کے منازل کا ایک سچا
فوٹو اُتارا ہے کہ قابل دید ہے۔
نظم میں شعرائے اردو کے ارکانِ ثلاثہ کے کلام سے پہلے انتخاب
لیا گیا۔ اُس کے بعد اور شعرا کا۔ یہ امر مسلّم ہے کہ فارسی طرز
کے زوردار قصائد ابتداءً سوداؔ کے برابر اور آخر زمانہ میں
ذوقؔ سے بڑھکر کسی نے نہیں لکھے۔ تصوّف جو ایشیائی شاعری

کا جزو اعظم ہے میر درد سے بہتر آجتک کوئی نہیں لکھ سکا۔ زبان کی سلاست جیسی میر تقی میر میں ہے کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور سودا۔ میر۔ درد۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے محض شاعری ہی نہیں کی بلکہ زبان کو تمام عیوب سے پاک و صاف کیا۔ ناسخ اور آتش کو بھی زبان کی خدمت میں وہی رتبہ حاصل ہے۔ جو سودا میر۔ درد کو تھا۔ انھوں نے جو عیوب باقی رہ گئے تھے اُن کو درست کرکے زبان کو نہایت فصیح و بلیغ بنادیا۔ اُس وقت سے لکھنؤ میں یہی زبان جاری ہوگئی۔ ان کا کلام لکھنؤ کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ غالب سے بڑھکر فلسفیانہ کلام کسی نے نہیں لکھا۔ انیس اور دبیر نے نظم اُردو میں جس قدر وسعت دی اور اُردو زبان کو جس قدر اُنسے مدد پہونچی آخر زمانہ میں کسی سے نہیں پہونچی۔ صدہا جدید محاورے ایجاد کئے۔ صدہا جدید الفاظ زبان میں داخل کردئے۔ امیراللہ تسلیم کی مثنویاں لاجواب ہیں۔ حالی نظم میں طرز جدید کے موجد اور مسلّم الثبوت اُستاد ہیں۔ اقبال حالی کے قدم بقدم چلتے ہیں اور اس زمانہ میں اُن کا طرز نہایت مقبول ہے۔ میر اکبر حسین اپنے طرز خاص میں مسلّم الثبوت اُستاد ہیں۔

اِس انتخاب میں جن لوگوں کا کلام لیا گیا ہے اُن کے حالات اور اُن کے خصوصیات بھی لکھے گئے ہیں جس سے طلباء کو کلام کے سمجھنے کا ایک مذاق پیدا ہوجائیگا۔ ناظرین سے اُمید ہے کہ اگر کہیں زلّت و لغزش پائیں تو اصلاح فرمائیں۔ ہدف ملامت نہ بنائیں۔ فقط

ناچیز جلال الدین احمد جعفری زینبی کان اللہ لہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میر امنؔ دہلوی

بڑے نامور اور خاندانی شخص گذرے ہیں ÷ فنِ شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اپنی طبیعت کی موزونی سے آپ شاعر بن گئے۔ خود فرماتے ہیں۔ کہ میری اُردو ٹکسالی ہے۔ کیونکہ میں دِلّی کا روڑا اور یہیں کا پرورش یافتہ ہوں۔ اِنکے آبا و اجداد ہمایون بادشاہ کے عہد سے شاہان مغلیہ کی خدمت میں با اعزاز و صاحب جاگیر و مناصب رہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب دِلّی کے گرد و نواح میں جاٹوں کا عمل ہوگیا۔ تو سورج مل جاٹ نے اُن کی جاگیریں ضبط کرلیں۔ اور احمد شاہ دُرّانی نے انکا گھر بار تاخت و تاراج کردیا۔ اُس وقت مجبوراً آپ نے اپنا وطن چھوڑکر پُورب کا رُخ کیا۔ کچھ روز عظیم آباد قیام کرکے تلاش روزگار کلکتہ پہنچے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں کلکتہ کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم میں سرکار انگریزی کی طرف سے ایک کالج اُن انگریزوں کی تعلیم کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ جو ولایت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوکر ہندوستان آیا کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے گل گرائسٹ صاحب کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ صاحب موصوف کو ہندوستانی زبان کی تدوین کا خاص شوق تھا اُنھوں نے خود بھی انگریزی زبان میں قواعد اُردو لکھی اور ڈکشنری تیار کی۔ اور قابل مصنفوں سے نثر اُردو میں کتابیں لکھوائیں۔

منشی میر بہادر علی صاحب نے ڈاکٹر گل گرائسٹ صاحب بہادر کے روبرو اِنکو پیش کردیا۔ اُنھوں نے قدر افزائی فرمائی۔ بے روزگاری کی شکایت دفع

ہوئی اور کلکتہ آپ کا مسکن ہوگیا سنہ ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گل گرائسٹ صاحب کی فرمائش سے آپ نے قصۂ چہار درویش مصنفہ امیر خسرو دہلوی فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا اور اُس کا نام باغ و بہار رکھا۔ اِن کی زبان صاف اور سلیس اور عام فہم ہونے کے علاوہ اُس زمانہ کی روز مرّہ اُردو اور محاورات دہلی کا نہایت صحیح نمونہ ہے۔

انتخاب از باغ و بہار

پہلے درویش کی سیر

یہ سرگذشت میری ذرا کان دھر سُنو | مجکو فلک نے کردیا زیر و زبر سُنو
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدّت مرے تئیں | اُس کا بیاں کرتا ہوں تم سر بسر سُنو

اے یاراں! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اِس عاجز کا ملک التّجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا اُس وقت میں کوئی مہاجن یا بیپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرّر تھے۔ اور لاکھوں روپے نقد اور جنس مُلک مُلک کے گھر میں موجود تھے۔ اُن کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضور میں حاضر اور بولتا ہے۔ اور دوسری ایک بہن۔ جس کی قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی ایک شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت ہو اور ایک لڑکا ہو اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوچلے سے ماں باپ کے سایہ میں پرورش پائی۔ اور پڑھنا لکھنا۔ سپاہگری کا کسب و فن سوداگری کا بہی کھاتہ

روزانہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گذری۔ کچھ دنیا
کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بیک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے
مر گئے۔ عجب طرح کا غم ہوا۔ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ یکبارگی یتیم ہو گیا۔
کوئی سر پر بوڑھا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا
پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کر کے گذرے۔ چہلم میں اپنے بیگانے
چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی
پگڑی بندھوائی۔ اور سمجھایا "دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں۔ اور
اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو۔ اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی
جگہ تم سردار ہوئے۔ اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار ہو" تسلی دیکر وے رخصت
ہوئے۔ گماشتے۔ کاروباری نوکر چاکر۔ جتنے تھے۔ آن کر حاضر ہوئے نذریں دیں
اور بولے "کوٹھی نقد و جنس کی اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجیے۔" یکبارگی جو
اس دولت بے انتہا پر نگاہ پڑی۔ آنکھیں کھل گئیں۔ دیوانخانے کی تیاری کا
حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے چلونیں تکلف کی
لگا دیں۔ اور اچھے اچھے خدمتگار چوبدار نوکر رکھے۔ سرکار سے زرق برق
کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے پھانگڑ
مفت کھانے پینے والے۔ جھوٹے خوشامدی آکر آشنا ہوئے۔ اور مصاحب
بنے۔ ان سے آٹھ پہر صحبت ہونے لگی۔ ہر طرح کی باتیں اور زٹلیں۔ واہی
تباہی ادھر ادھر کی کرتے۔ اور کہتے "اس جوانی کے عالم میں عیش کیجیے۔"
غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج
بہک گیا۔ شراب۔ ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہونچی
کہ سوداگری بھول کر تماش بینی اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور

رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی۔ جو جس کے ہاتھ پڑا۔ الگ کیا۔ گویا لوٹ مچادی۔ کچھ خبر نہ تھی۔ کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے؟ کہاں سے آتا ہے؟ اور کدھر جاتا ہے مالِ مُفت دلِ بے رحم۔ اِس وَرخرچی کے آگے اگر گنجِ قارون ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں یکبارگی یہ حالت ہوئی۔ کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے۔ اور چمچا بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے۔ کافور ہوگئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں ملاقات ہوجاتی۔ تو آنکھیں چُرا کر مُنھ پھیر لیتے۔ اور نوکر چاکر۔ خدمتگار بھلئے۔ ڈھلیت۔ خاص بردار۔ رکابتحانے سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا۔ جو کہے یہ کیا تمھارا حال ہوا۔ سوائے غم و افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھڈّیاں میسّر نہیں۔ جو چبا کر پانی پیوں دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے۔ تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ ناچار بے حیائی کا بُرقع مُنھ پر ڈال کر یہ قصد کیا۔ کہ بہن کے پاس چلیئے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی۔ کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا۔ نہ خالی خط لکھا۔ بلکہ اُس نے دو ایک خط خطوط ماتم پُرسی کے اور اشتیاق کے جو لکھے اُن کا جواب بھی اُس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔ اِس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا۔ پر سوائے اُس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پاپیادہ۔ خالی ہاتھ۔ گرتا پڑتا۔ ہزار محنت سے وے منزل کاٹکر ہمشیرہ کے شہر میں جاکر۔ اُس کے مکان پر پہونچا۔ وہ ماں جائی میرا حال دیکھ بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل ماش۔ کالی ٹکے مجھ سے صدقے کئے۔ کہنے لگی۔ اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا۔ لیکن بھیّا! تیری یہ کیا صورت بنی؟ اِس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر

چیکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا حمام میں بھیجا نہا دھو کر
وے کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو
مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات۔ حلوا سوہن۔ پستہ مغزی ناشتہ کو۔
اور تیسرے پہر میوے خشک و تر۔ پھل پھلاری۔ اور رات دن دونوں
وقت پلاؤ۔ نان۔ قلیے۔ کباب۔ تحفہ تحفہ۔ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو
کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسے تصدیع کے بعد جو یہ آرام
پایا۔ خدا کی درگاہ میں ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گذرے
کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔ ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے
میری خاطر داری رکھتی تھی۔ کہنے لگی۔" اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی
اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔
جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں
کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد
نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے۔ اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوص۔
اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے یہ اپنے
باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔" یہ نہایت بے عزتی
اور میری تمھاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں
تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں۔ اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب
یہ صلاح ہے۔ کہ قصد سفر کا کرو۔ خدا چاہے۔ تو دن پھریں۔ اور اس حیرانی
اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔" یہ بات سنکر مجھے بھی غیرت
آئی۔ اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا۔ "اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو۔ جو کہو
سو کروں۔" میری مرضی پاکر گھر میں جاکر پچاس توڑے اشرفی کے اصیل اور

لونڈیوں کے ہاتھ میں لوا کر میرے آگے لا رکھے۔ اور بولی "ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔ تم ان روپیوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایمان دار کے حوالے کر کے دستاویز پکّی لکھوا لو اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو۔ اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجیو یا آپ بیچیو۔" میں وہ نقد لیکر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر کے ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت و خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ اور فقیر نے خشکی کی راہ لی چلنے کی تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا۔ بہن نے ایک سراپا بھاری جوڑا اور ایک گھوڑا جڑاؤ سازی تواضع کیا۔ اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا۔ اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا۔ دہی کا ٹیکہ ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی "سدھارو تمھیں خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھائے جاتے ہو۔ اسی طرح جلد اپنا منھ دکھائیو۔" میں نے فاتحہ خیر پڑھ کر کہا۔ "تمھارا بھی اللہ حافظ ہے میں نے قبول کیا" وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے آغا نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مذاق سخن رکھتے تھے۔ اردو نثر اچھی لکھتے تھے۔ واجد علی شاہی دور کے مشہور نثار اور مقفّیٰ نگار تھے۔ شگوفۂ محبت۔ گلزار سرور

انشاے سرور۔ سرورِ سلطانی۔ فسانۂ عجائب اُن کی تصانیف سے یادگار ہیں اُنکی بہترین تصنیف فسانۂ عجائب ہے۔ یہ طرزِ انشا اُس زمانہ میں نہایت مقبول تھی۔ لیکن اب بالکل مُردہ و افسردہ ہے۔ فسانۂ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز اس رنگ میں بھی کیا کیا رنگینیاں پیدا کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی اسکے یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ کہ اس طرز کا میدان کس قدر تنگ ہے اور زمانۂ حال کی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیئے کس قدر ناقابل ہے ✤

انتخاب از فسانۂ عجائب

شاہزادہ کے بندر ہونے کے بعد قتل گاہ جانے کی سرگذشت

جس وقت تاجرِ ماہ نے متاعِ انجم کو نہاں خانۂ مغرب میں چھپایا۔ اور شحنۂ چرخِ چہارم خونخواری کو مشرق سے نکل آیا۔ سوداگر نماز صبح پڑھ ہاتھی پر سوار ہوا۔ کمر میں پیش قبض رکھ۔ گود میں بندر کو بٹھا۔ مرنے پہ کمر مضبوط باندھ کر چلا۔ بندر سے کہا "پریشان نہ ہو۔ جب تقریر سے اور اصرافِ کثیر سے کام نہ نکلے گا۔ جو بن پڑے گا۔ وہ کردوں گا۔ اپنے جیتے جی تجھے مرنے نہ دوں گا۔ قولِ مرداں جاں دارد۔ مصرعہ" بعد از سر من کن فیکون شد۔ شدہ باشد۔

سوداگر کا سراسیمہ باغم و الم آگے بڑھنا۔ کہ خلقت نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بندر لوگوں سے مخاطب ہوکر یہ کہنے لگا۔ میر سوز

برقِ طپیدہ یا شررِ جہیدہ ہوں | جس رنگ میں ہوں میں غرض آفت رسیدہ ہوں
اے اہلِ بزم۔ یکں کسی فرقع میں دہر کے | تصویر ہوں۔ولے اسیرِ حسرت گزیدہ ہوں

صیّاد اپنا دام اٹھا لے کہ جوں صبا ہوں تو چمن میں پر گلِ عشرت نہ چیدہ ہوں
بے آہ و نالہ مجھ سے نہ آگے چلو کہ میں بچھڑا ہوں کارواں سے مسافر جریدہ ہوں
غم ہوں الم ہوں درد ہوں سوز و گداز ہوں سب اہلِ دل کے واسطے میں آفریدہ ہوں

صاحبو! دُنیائے دوں - نیرنگیِ زمانۂ سفلہ پرور بوقلموں - عبرت و دید کی جا ہے - گرما گرم آیند و روند کا بازار ہے - کس و ناکس جنسِ ناپائدار لہو و لعب کا خریدار ہے - اپنے کام میں مصروف قضا ہے - جو شے ہے فنا ہے - معاملاتِ قضا و قدر سے ہر ایک ناچار ہے - یہی مسئلہ جبر و اختیار ہے - کوئی کسی کی عداوت میں ہے - کوئی کسی کا شیدا ہے - جسے دیکھا آزاد نہ پایا - کسی نہ کسی بکھیڑے میں مبتلا ہے - ایک کو اتنا سوجھتا نہیں - کیا لین دین ہو رہا ہے - سود کی اُمید میں سراسر زیاں ہے - بڑی ہونے کا سودا ہے - اُس کی قدرتِ ناطقہ دیکھو مجھ سے بے زبان ناچیز کو بے تکلّف گویائی عنایت کیا - تم سب کا سامعوں میں چہرہ لکھدیا - باتیں سننے کو ساتھ چلے آتے ہو - جدائی میری شاق ہے - جو ہے مشتاق ہے - حال زار پر رحم کھا آنسو بہاتے ہو - یہ رحیمی کی صفت ہے - شان تمہاری دیکھو! اسی تقریر کی دھوم سے ایک ظالم شوم سے مجھ مظلوم کا مقابلہ ہوتا ہے - یقین کامل ہے - وہ قتل کرے گا - بے گناہ کے خون سے ہاتھ بھرے گا - سَوَادُ الوُجہِ فِی الدَّارَین ہوگا - تب اُسے آرام و چین ہوگا - یہ گویائی گویا پیامِ مرگ تھا - دُنیا جائے آزمائش ہے - سفیہ جانتے ہیں یہ مقام قابلِ آرام و آسائش ہے - دو روزہ زیست کی خاطر کیا کیا ساز و سامان پیدا کرتے ہیں! فرعون بے سامان ہوکر زمین پر پاؤں نہیں دھرتے! جب سر کو اٹھا - آنکھ بند کر چلتے ہیں - خاکساروں کے سر کچلتے ہیں - آخر کار حسرت و ارمان غلط لے کر مرتے ہیں - جان اُس کی جستجو میں

کھوتے ہیں۔ جو شے ہاتھ آئے دقّت سے جمع ہو۔ پریشانی و مشقّت سے پامال رہے۔ خستگی سے جھوٹ جائے یاس و حسرت سے پھر سر پہ ہاتھ دھر روتے ہیں۔"

ناسخ

دُنیا اِک زال بیسوا ہے ۔۔۔ بے مہر و وفا و بے حیا ہے
مَردوں کے لئے یہ زن ہے رہزن ۔۔۔ دُنیا کی عدو ہے دین کی دشمن
رہتی نہیں ایک جا یہ جم کر ۔۔۔ پھرتی ہے برنگ زر و گھر گھر

"انجام شاہ و گدا۔ دو گز کفن اور تختۂ تابوت کے سوا نہیں۔ کسی نے اوڑھا یا محمودی کا دیا۔ یا تحریر کربلا۔ کسی کو گزبھر گاڑھا میسّر ہوا۔ بعد کرب و بلا اُس نے صندل کا تختہ لگایا۔ اِس نے بیر کے چھلوں میں چھپایا۔ کسی نے بعدِ دفن سنگ مرمر کا مقبرہ بنایا۔ کسی نے مرمر کے گور گڑھا پایا۔ کسی کا مزار مُطلّا مُنقّش۔ رنگا رنگ ہے۔ کسی کی مانندِ سینۂ جاہل گور تنگ ہے۔ حسرتِ دنیا سے کفن چاک ہوا۔ بستر دونوں کا فرشِ خاک ہوا۔ نہ امیر سمور و قاقم کا فرش بچھا سکا۔ نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا بوریا لا سکا۔ بعد چندے جب گردشِ چرخ نے گنبد گرایا۔ اینٹ سے اینٹ بجایا۔ تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گورِ شاہ ہے۔ یہ لحدِ فقیر ہے۔ اُس کو مرگِ جوانی نصیب ہوئی۔ یہ استخوانِ بوسیدۂ پیر ہے۔ سو یہ بھی خوش نصیب نیک کمائی والے گور گڑھا کفن پاتے ہیں۔ نہیں تو سینکڑوں چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر مر جاتے ہیں۔ لوگ در گور رکھ کے چلے آتے ہیں۔ کتّے۔ بلّی۔ چیل۔ سو کھے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ دامنِ دشت۔ عریاں کفن۔ گورِ بے چراغ صحرا کا صحن ہوتا ہے۔ یاس و حسرت کے سوا کوئی نہ سرہانے روتا ہے۔ کتّا چھٹے کوئی پائینتی نہ ہوتا ہے۔ سالہا مقبروں کی عمارت عالی اور ساز و سامان

کی دیکھا بھالی میں سریع التاثیر ہے۔ ہزاروں رنج گور پہ چراغ غریباں کی دید میں بیٹھے بٹھائے سہے۔ طرفہ نقل ہے کہ والی وارث اُن کے سرِ سلطنت مسندِ حکومت پر شب و روز جلوہ افروز ہے۔ مگر تنبیہ غافلوں کو قدرتِ حق سے گنبدوں میں آشیانۂ زاغ و زغن۔ میناروں پر مسکنِ بوم شوم قبروں پہ سنگ تُوٹتے دیکھے۔ میر

مزارِ غریباں تماشے کی جا ہے! وہ سوتے ہیں پھرتے جو کل جا بجا تھے

"رنگِ چمن صرفِ خزاں دیکھا۔ ڈھلا ہوا حُسنِ گلرخاں دیکھا۔ اگر گلِ خنداں پہ جوبن ہے۔ بہار ہے۔ غور کیا۔ تو پہلوے نازنیں میں نشتر سے زیادہ خلشِ خار ہے۔ سینہ فگار ہے۔ دُنیا میں دن رات زق زق بق بق ہے۔ کوئی چہچہے کرتا ہے۔ کسی کو قلق ہے۔ نوش کے ساتھ گزند نیش ہے۔ ہر رہرو کو کڑی منزل در پیش ہے"۔ مؤلف

بلبل کو خزاں میں جان کھوتے دیکھا صیّاد کو سر پٹک کے روتے دیکھا
گلچیں کی بھی نیند اُڑ گئی یک بارگی جو اہلِ دُوَل تھے اُن کو سوتے دیکھا

مدّتوں صدائے مرغِ سحر کے رنج اُٹھائے۔ کبھی دم نہ مارا۔ شکوہ لب پر نہ لائے۔ برسوں ندائے اللہ اکبر کے صدمے سہے۔ شکر کیا۔ چُپ رہے پھیپھو سحر کی آواز نے دَم بند کیا۔ قلق جی پہ لیا۔ نالہ نہ بلند کیا۔ سوچے۔ تو وصل مہرویاں خوابِ شب تھا۔ لُطف اُٹھا عیش عجب تھا۔ تمام عالم کی خوب سیر کی۔ کبھی حرم محترم میں مسکن رہا۔ گاہ دُھونی۔ رمائی کنشت و دیر کی۔ عالم سے آیۃ۔ حدیث۔ وعظ و پند سُنا۔ ناقوس برہمن سُن سر دُھنا۔ وہ یہ کیش۔ مانعِ لذّتِ صنم لطفِ دلبیت حظِّ نفس کا دشمن تھا۔ یہ کوتہ اندیش رخنہ پردازِ اہلِ ایمان و دین کا رہزن تھا۔ تامّل کیا۔ تو اِن دونوں سے بڑھ

حسد بغض بُرا ہونا معلوم۔ اپنے نزدیک اُنکا انجام بخیر ہونا معلوم ۔ واللہ اعلم
یہ لوگ کیا سمجھے؟ خود اچھے ٹھہرے اور کو بُرا سمجھے مطلب کی بات ہیہات
دونوں کی سمجھ میں نہ آئی ۔ بایں دانائی اُن سے خدا سمجھے" مؤلف

اچھے کو بُرا ہے کو اچھا سمجھے کتنی یہ بُری سمجھ ہے اچھا سمجھے

"دنیا فقط رہگزر ہے ۔ ہر دم مثالِ تارِ نفس در پیش سفر ہے ۔ تا زیست
ہزاروں مقصدے ہیں ۔ ڈر ہے ۔ مرنے کے بعد باز پرس کا خطر ہے ۔ کسی طرح انسان
کو مفر نہیں ۔ کونسا نفع ہے؟ جس کی تلاش میں ضرر نہیں ۔ حاصلِ کار یہ ہے ۔
دنیا میں جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم کرے ۔ تا مقدور کسی کی خاطر نہ برہم کرے "
وگرنہ شعر

نیم شبے آہ زندہ پیر زال دولت صد سالہ کند پائمال

"دلِ شکستہ کی دلداری ۔ پا اُفتادہ کی مددگاری کرے ۔ ہوا و ہوس جو
دل سے دُور ہو جائے تو مال سے یا کمال سے عُجب و نخوت نزدیک نہ آئے ۔
عنایتِ ایزدی پر قائم ہو ۔ شکر ہر نعمت ۔ سپاسِ خدمت کرکے منہیات کا
مانع ہو ۔ رنج کا حال رہے ۔ سب رنگ میں شامل رہے ۔ زمانے کے تکدرات سے
گھبرائے نہیں ۔ صحبت غیر جنس سے نفرت کرے ۔ تو بدنامی پاس آئے نہیں ۔
دولت کا اعتبار کیا؟ مفلسی سے ننگ و عار کیا؟ ایک دن مرنا ہے ۔ جینا
مستعار ہے ۔ اس پر کس کا اختیار ہے؟ نیک عمل کا خیال رکھے ۔ کہ قیدِ ہستی
سرشت کا نام ہے ۔ رہائی یہاں سے انجام ہے ۔ شعر

کسی کا مرگ پر اے دل نہ کیجئے چشم تر ہرگز بہت سا رو دیئے اب ہر جو اس جینے پہ مرتے ہیں"

"عمرِ خضر کی تمنا اور حشمت خسروانہ! خزانۂ قارون کی فکر میں ہر ایک
صباح و مسا ذلیل و خوار ہے تحصیل لا حاصل ۔ کوشش اس امر میں سراسر

بیکار ہے۔ بقول۔ ناسخ

ہاتھ آتی ہے کب علم و ہنر سے دولت ۔۔۔ ملتی ہے قضا اور قدر سے دولت
جو علم و ہنر رکھتے ہیں وہ ہیں محروم ۔۔۔ مانوس ہے بل احمق و خر سے دولت

"روپے کا جمع ہونا۔ جواہر کی تلاش میں دن کا جاگنا۔ چاندی سونے کی امید میں رات کا نہ سونا۔ جنھیں میسّر ہر بار ہے۔ انھیں مفارقت دنیا ناگوار ہے۔ اور یہ کلام ہے" مؤلف۔

یہاں کے جانے سے جی الجھتا ہے ۔۔۔ کیا ہی دلکش سرائے فانی ہے

"سلف سے اہل کمال دنیا کے مال سے محروم رہے۔ جو سزاوار حکومت تھے وہ محکوم رہے" حافظ

ابلہاں را ہمہ شربت زگلاب و قند است ۔۔۔ قوتِ دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم
اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں ۔۔۔ طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

لیکن کبھی صبح عشرت ہے۔ گاہ الم کی شام ہے۔ دنیا عجب مقام ہے نہ امیر ہوتے کچھ عرصہ۔ نہ فقیر ہوتے کچھ دیر ہے۔ اس کارگاہِ بے ثبات میں عجب اندھیر ہے" سودا

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایّام پہ سوار ۔۔۔ رکھتا نہیں ہے ہاتھ عناں کا بیک قرار
جتنے طویلہ بیچ کئی دن کا ذکر ہے ۔۔۔ ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے ۔۔۔ موچی سے کفش پا کو گنٹھاتے ہیں وہ اُدھار

اب جب وعدہ آپہونچا۔ تو نہ روپیہ کام آتا ہے۔ نہ فوج ظفر موج سے کچھ ہوتا ہے۔ نہ تیغِ جرّار بچاتا ہے نہ کوئی آشنا دوست آڑے آئے۔ نہ عزیز و اقربا پنجۂ ملک الموت سے چھڑائے۔ اگر یہی امر مانع قضا و قدر ہوتے۔ جمشید و کاؤس۔ دارا و سکندر بصد حسرت و افسوس جان نہ کھوتے۔

نیک عمل کرے۔ تو وہ ساتھ جاتا ہے۔ احتیاج کسی کی بر لائے۔ یا اللہ پچھ دے۔ یہ البتہ کام آتا ہے۔ وگرنہ دُنیا سراب۔ زندگی بدتر از حباب ہے۔ پابند اسکا خراب۔ ترک کرنے والا نایاب ہے"

شعر

ترکِ دُنیا کا سوچ کیا ناسخ ۔۔۔ کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

شعر

اس گلشنِ ہستی میں عجب سیر ہے لیکن ۔۔۔ جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا

"الا مقتضائے عقل یہ ہے۔ کہ عالمِ اسباب میں کسی کا پابند نہ ہو۔ تعلق خاطر نہ رکھے۔ ہمیشہ اس نے بھلے سے بُرائی کی ہے۔ جو گیا یہاں سے۔ یعنی جہانِ گذراں سے۔ اسکا شاکی تھا۔ بادشاہ سے فقیر تک۔ جوان سے پیر تک حقیقت میں نفس امارہ سخت ناکارہ ہے۔ اس کو بہر کیف پچھاڑے۔ گردِ ہوا و ہوس سے دامن جھاڑے۔

شعر

دیوانہ باش تا غمِ تو دیگراں خورند ۔۔۔ آں را کہ عقل بیش غمِ روزگار بیش

آدمی کو لازم ہے۔ وہ بات پیدا کرے۔ تا صفحۂ دنیا پر چندے بہ نیکی نام یاد رہے۔

شعر

اِس طرح جی کہ بعد مرنے کے ۔۔۔ یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

"دنیا میں کسی سے دل نہ لگائے۔ کہ یہ کارخانہ بہت بے ثبات ہے۔ وصل سے فرحت ہجر سے مصیبت اپنے سر پر نہ لائے۔ کہ مرجانے کی بات ہے معشوق باوفا عنقا کی طرح ناپیدا ہے۔ اور پُر دغا ہرجائی ہر جا مہیّا ہے۔ خواہش کا انجام کاہش ہے۔ تمنّا دل سے دُور کرنے میں جان کی آسائش ہے" مؤلف۔

کبھی نہ چین سے رہنے دیا تمنّا نے ۔۔۔ خراب و خستہ ہیں اس دل کی آرزو سے ہوا

مگر وائے غفلت! ہائے نادانی! کہ جب نشاۓ جوانی کا موسم پیری میں خمار آتا

ہے۔ اسوقت آدمی سر پہ ہاتھ دھر کر روتا ہے۔ وقتِ از دست رفتہ و تیر از شست جستہ کب ہاتھ آتا ہے۔ وہ ناچار ہو کفِ افسوس مل کے پچھتاتا ہے۔ گذشتہ را صلوات کہہ کے دل کو سمجھاتا ہے۔"

آدمیوں کو بندر کی تقریر دل خراش پر اثر سے عبرت و حیرت حاصل تھی۔ کبھی نصیحت و پند۔ نگاہ کلام رنگین و دلچسپ باولِ دردمند۔ کبھی سخنانِ حسرت فزا سناتا چلا جاتا تھا اہلِ دل طبیعت گداز سے رونے ساتھ آتے تھے ہر فقرہ پر درد پر ضبط نہ ہو سکتا تھا چلاتے تھے۔ خلقِ خدا جنازہ کی طرح ساتھ کے ہمراہ تھی۔ ایک عالم کے لب پر نالے تھے۔ فغاں و آہ تھی۔ اسی سامان سے ملک کے تھرو کے تلے پہونچے۔

نجم الدولہ۔ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب

ان کا خاندانی سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی آئے۔ یہاں فوج کے ایک معزز عہدہ پر سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے بعد ان کے والد عبد اللہ بیگ خاں لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہونچے۔ چند روز بعد حیدر آباد میں جاکر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے۔ اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کی ۵ برس کی عمر تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے۔ انھوں نے اس دُرِّ یتیم کو دامن میں لیا۔

مرزا چچا کے سایہ میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اتفاق یہ ہے کہ مرگ ناگہانی میں وہ بھی مرگئے۔ بزرگوں سے لاکھوں روپیہ کی جایداد چھوڑی تھی۔ قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے؟ وہ امیرزادہ جو شاہانہ دل و دماغ لیکر آیا تھا۔ اُس کو اِسی ملکِ سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کرکے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے۔ مگر سب کھیل بنکر بگڑ گئے۔ دلّی کی تباہی کے بعد زیادہ مصیبت پڑی۔ اُس وقت رامپور تشریف لے گئے۔ نواب صاحب رامپور نے ۱۰۰ روپیہ مہینہ مقرّر کردیا۔ مگر مرزا وہاں زیادہ نہ رہ سکے۔ پھر دلّی واپس آئے۔

مرزا اہلِ ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اُردو اُن کی مادری زبان نہ تھی مگر اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا۔ کہ اِس زبان کے مسلّم الثبوت اُستاد ہوگئے۔ تصنیفات اُردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک انتخابی دیوان ہے۔ کہ ۱۸۴۹ء میں مرتّب ہوکر چھپا۔ اِنکے کلام میں دو باتیں خصوصیت کی پائی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی اِنکا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی مشق زیادہ تھی۔ اور اُس سے اُنکیں طبعی تعلّق تھا۔ اس لئے اکثر الفاظ اِس طرح ترکیب دے جاتے تھے۔ کہ بول چال میں اِس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر نکل گئے ہیں۔ وہ ایسے ہیں۔ کہ جواب نہیں رکھتے۔

اُردو زبان میں رقعات کے دو مجموعے اُن کے مرتّب ہوکر شائع ہوئے۔ ایک عودِ ہندی اور دوسرا اُردوئے معلّٰی۔ اِن خطوط کی عبارت ایسی ہے۔ گویا آپ سامنے بیٹھے گُل افشانی کر رہے ہیں۔ اِس میں بھی فارسی کی ترکیب اور محاوروں کا استعمال کر گئے ہیں۔ ان خطوط کی طرزِ عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے۔ کہ ظرافت کے چٹکلے۔ اور لطافت کی شوخیاں اِس میں خوب ادا ہوسکتی ہیں۔ یہ اُنھیں کا ایجاد تھا۔ کہ آپ مزا لیا۔ اور اوروں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں۔

مرزا نے ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء میں اِس جہانِ فانی سے انتقال کیا۔

انتخاب از رقعات

۱۔ بنام مرزا حاتم علی۔ مہر

مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے۔ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو۔ کہ یہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے۔ کہ تمھارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی۔ نہ کتابوں کا پورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے۔ کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے دے آیا ہوں۔ اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے۔ جو تم نے خبر دی ہے۔ کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے؟ اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ "تمھاری چالیس۴۰ کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمھارے پاس پہونچ جائیں گی۔" آپ حضرت ارشاد کریں۔ کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو۔ مگر ایسا کچھ لکھو۔ کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے۔ ان تینتیس۳۳ جلدوں کے ساتھ۔ یا دو۲ تین۳ روز آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔ تا خاص و عام میں جا بجا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا۔ انھوں نے لکھ لیا۔ ان

دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپئے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے۔ کہ ایک فقیر۔ کہ وہ خوش آواز بھی ہے۔ اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے وہ کاغذ جو مجکو دکھایا۔ یقین سمجھنا۔ کہ مجکو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں۔ اور صلہ میں اس کے اِس خط کا جواب چاہتا ہوں۔ غزل

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا — مَیں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اِک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے — لے کے دل دلستاں روا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالب غزل سرا نہ ہوا

جواب کا طالب غالب

۲

بندہ پرور! آپکا خط کل پہونچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا۔ کتنا شتاب لکھتا ہوں۔ مطالبِ مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے۔ کہ برابر کئی خطوں میں تمکو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے۔ تو شکایت کی کیا گنجائش ہے؟ بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں در خور افزائش ہے۔ بقول

غالب علیہ الرحمۃ بیت

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو؟

ہے ہے حُسن مطلع! اسے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوا تو دوست جس کا دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

افسوس ہے۔ کہ اِس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے۔ اور اگر خدا نخواستہ باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو۔ ہم اِس بوجھ کو مردانہ اُٹھا رہے ہیں۔ تم بھی اُٹھاؤ اگر مرد ہو۔ بقول غالب مرحوم۔ شعر

ولا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر   نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

سحر ہوگی۔ خبر ہوگی۔ اِس زمین میں وہ شعر۔ یعنی۔ شعر

تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر   جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

کتنا خوب ہے! اُردو کا کیا اچھا اسلوب ہے۔ قصیدہ کا مشتاق ہوں خدا کرے جلد چھاپا جاوے تو ہمارے دیکھنے میں بھی آئے۔

کیا کہئے۔ بھلا کہئے۔ یہ زمین ایک بار یہاں طرح ہوئی تھی۔ مگر بحر اور ہی تھی۔ وہ غزل یہ ہے۔

غزل

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے   تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں   مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے
نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں   وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے
جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنئے   جو نا سزا کہے اُس کو نہ نا سزا کہئے
کہیں حقیقت جاں کاہی مرض لکھئے   کہیں مصیبت ناسازی دوا کہئے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے　　کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے　　کٹے زباں تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے　　طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب　　خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

اور وہ جو فاعلاتن ۔ فعلاتن فعلاتن فعلن ۔ یہ بحر ہے ۔ اس میں ایک قطعہ ہے ۔ کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا ۔ تقریب یہ ہے ۔ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے ۔ اُنھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھکر مجھسے کہا ۔ کہ "اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے" میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ کہکر اُنکو دیا ۔ اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لی ۔ وہ قطعہ لکھتا ہوں ۔ قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی　　زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اِسے کیا لکھیے　　ناطقہ سر بگریباں کہ اِسے کیا کہیے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے　　حرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے
مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے　　داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے　　سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے　　خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہیے
حجر الاسود دیوارِ حرم کیجیے فرض　　نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اُسکو اگر مانیے قافِ تریاق　　رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے　　کیوں اِسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اِسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے　　کیوں اِسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض　　اور اِس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

آپ کے خط کے جواب نے انجام پایا - اب میرا دردِ دل شنو - برخوردار
منشی شیو نرائن نے میرے دو خطوں کا جواب نہیں لکھا - اور وہ خطوط
جواب طلب تھے - تم انکو میری دعا کہو - اور کہو کہ میاں میرا کلام بندہ ہے
اُس مطلبِ خاص کا جواب جلد لکھو - یعنی اگر وہ کتاب بن چکی ہے - تو
بھیجو - اور اگر اُس کے بھیجنے میں دیر ہے - تو یہ لکھ بھیجو - کہ وہ سیاہ
قلم کی لوح ہے یا طلائی ؟" فقط

جواب کا طالب غالب

۳۳

بہت سہے غمِ گیتی شراب کم کیا ہے | غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی | یقیں ہے ہمکو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

علاقۂ محبّتِ ازلی کو حق مان کر اور حقوقِ غلامیِ جناب مرتضیٰ علی رضہ کو
سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں - کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے - مگر
شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے - مانا کہ روشنائی اُس کے اجارے میں آگئی
ہے - یہ بھی دلیلِ آشنائی ہے - کیا فرض ہے کہ جب تک دید وا دید نہ ہو لے
اپنے کو بیگانہ یکدگر سمجھیں ؟ سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان
ہے - خدا کرے وہ خط جس میں مَیں نے آپ کو سلام لکھا آپ کی نظر
سے گذر گیا ہو - احیاناً اگر نہ دیکھا ہو - تو اب مرزا تفتہ سے لیکر پڑھ
لیجئے گا - اور خط کے لکھنے کے احسان کو اُس خط کے پڑھ لینے سے دو بالا
کیجئے گا - ہائے میجر جان جاکوب ! کیا جوان مارا گیا ہے ؟ سچ اُس کا یہ
شیوہ تھا - کہ اُردو کی فکر کو مانع آتا - اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت
دلواتا - بندہ پرور یہ بھی انھیں میں سے ہے - کہ جن کا میں ماتمی ہوں -
ہزارہا دوست مر گئے - کس کو یاد کروں ؟ اور کس سے فریاد کروں ؟ جیوں

تو کوئی غمخوار نہیں۔ اور مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ۔ چشم بد دور! اردو کی راہ کے تو سالک ہو۔ گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی سے بھی یہ خوبی میں کم نہیں۔ مشق شرط ہے۔ اگر کہے جاؤ گے۔ لطف پاؤ گے۔ میرا تو بقولِ طالب آملی اب یہ حال ہے ؎

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے مجکو لکھا ہو۔ تو کیونکر مجکو اپنے خط کے جواب کی نہ تمنا ہو پہلے اپنا حال لکھئے۔ کہ میں نے سنا تھا۔ آپ کہیں کے صدرا میں ہیں۔ پھر آپ اکبر آباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟ اس ہنگامہ میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی۔ فقط

جواب کا طالب غالب

مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر کے نام

قبلہ۔ پہلے معنی ابیات بے معنی سنئے۔ شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ایران میں رسم ہے۔ کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔ جیسے مشعل دن کو جلانا۔ یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لیجانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے۔ کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے۔ کہ جو صورت تصویر ہے۔ اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثلِ تصویر اعتبارِ محض ہو۔ موجبِ رنج و ملال و آزار ہے۔ دوسرا شعر

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

رقیب بمعنی مخالف۔ یعنی شوق سرو ساماں کا دشمن ہے - دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا۔ تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر با تنِ عریاں ہی کھچتی ہے - جہاں کھچتی ہے -

۵

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب   تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے۔ جیساکہ اس شعر میں۔

شعر

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں   وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے

یعنی زخم تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے کے۔ اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی۔ تنگیِ دل کی کیا داد دیتا؟ وہ تو خود ضیق مقام سے گھبراکر پَر افشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔

نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے دس برس سے اندھا ہوگیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا۔ سن لیتا ہے عبارت لکھ نہیں سکتا۔ لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اُس کے ہموطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی ہی نہیں رکھتا۔ اور اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اُس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو اُنکا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ واے اُس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزّو وقار ہو! رسالہ اُس کا قاطع برہان دہلی پہونچ کر ڈھونڈونگا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہونچے گا۔ جناب مستطاب میر قاسم علی خاں صاحب صادق القول ہیں۔ میرے گھر آئے

ہونگے۔ دروازہ بند پایا ہوگا۔ مگر ایک خدشہ ہے۔ کہ حضرت میں اور میرے بھائی مرزا علی بخش خاں میں بہت ربط و اتحاد تھا۔ اور وہ مرحوم خدا بخش بیامرزاد۔ کذب و گزاف میں ضرب المثل تھا۔ اس تصوّر سے اگر اس جملے کے سچ جاننے میں تامّل کروں تو میرا تامّل بیجا نہوگا۔ بہرحال میرا سلام کہئے گا۔ والسّلام۔

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

رکھیو غالب مجھے اِس درد نوائی میں معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا اٹھتا ہے

بندہ پرور! تمکو پہلے یہ لکھا جاتا ہے۔ کہ میرے دوستِ قدیم میر کرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا۔ اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں۔ اور اِس سے زیادہ میرا حال مجکو بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی مہرؔ کی جناب میں میرا سلام کہنا۔ اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھ دینا۔ **شعر**

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب اے تو غائب ز نظر مہرِ تو ایمانِ من است

تمھارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا۔ کہ اُس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہونچا۔ صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو۔ اور وہ اُس میں بے تکلف عمر بسر کرے۔ اُس کا نام عیش ہے۔ تمھاری توجہ مفرط بطرف شعر و سخن کے تمھاری شرافتِ نفس اور حسنِ طبع کی دلیل ہے۔ اور بھائی یہ جو تمھاری سخن گستری ہے۔ اُس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اِس فن میں اب یہ ہے۔ کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ

جب دل اُلٹنے لگتا ہے۔ تو دس بار یہ مقطع زبان پہ آجاتا ہے **شعر**

زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گذری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں۔ اور تنگ آتا ہوں۔ تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔ **مصرعہ** اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے + یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجکو ہے۔ اسکا بیان تو معلوم۔ مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزوں کی قوم میں سے جو ان سیاہ رُوکالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اُس میں میرا کوئی اُمید گاہ تھا۔ اور کوئی میرا شفیق تھا۔ اور کوئی میرا دوست۔ اور کوئی میرا یار۔ اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز۔ کچھ دوست۔ کچھ شاگرد کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے؟ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اُس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو؟ ہائے! اتنے یار مرے کہ جواب میں مرونگا۔ تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ فقط

میر مہدی کے بھائی میر سرفراز حسین کے نام

نورِ چشم راحتِ جان میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ اور خوش رہو تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا۔ جو تُرے پیرہن یوسفؑ نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا تھا۔ میاں ہم تم بوڑھے ہیں۔ یا جوان ہیں۔ توانا ہیں۔ یا ناتوان ہیں۔ بڑے بیش قیمت ہیں۔ یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی کسی کو بھلا بھُلا سکتا ہے۔ **شعر**

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے۔ اور وہی مَیں ہوں۔ سیڑھیوں پہ نظر ہے۔ کہ وہ میر مہدی آئے۔ وہ میر سرفراز حسین آئے۔ وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہُوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہُوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ! ہزاروں کا مَیں ماتم دار ہوں۔ مَیں مرونگا۔ تو مجھکو کون رُوئے گا؟ سنو غالب رونا پیٹنا کیا؟ کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے۔ کہ یہ خط میرا مہدی کو پڑھواؤ۔ اور میرن صاحب کو بلاؤ۔ کل شام کو یا پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے۔ کہتے تھے۔ کہ کل یا پرسوں پانی پت کو جاؤنگا۔ مَیں نے اُن کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے۔ اگر بھول نہ جائیں گے۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے۔ کہ صاحب اِن تمہیں ہے۔ نہ ہو۔ غلام اشرف نہیں ہے۔ نہ ہو۔ اگر منظور کیجئے۔ تو مَیں صوفی ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ بموجب مصرع کے مصرع۔ دل بدست آور کہ حجّ اکبر است۔ تم سے کب انکار کرتا ہوں؟ اگر مرزا گوہر کی جگہ مانو۔ تو خوش۔ اگر غلام اشرف جانو تو راضی۔ رات کو اپنے گھر میں باتیں بناؤ۔ دن کو مجھ سے بھی کہلاؤ۔ قصّہ مختصر کرو۔ اور جلد کرو! سیّد انور کا جو حال لکھتے ہو۔ وہ سچ ہے۔ راجپوت ایسا ہی کچھ کرتے ہیں۔ مگر تمہارا راجہ مسلمانوں کا دم بھرتے ہیں۔ فقط

خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام

قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے۔ کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے۔ وہ کیا کھاتا پیتا ہے؟ اور کیونکر جیتا ہے؟ پنشن قدیم

اکیس۲۱ مہینہ سے بند۔ اور رئیس سادہ دل فتوح جدید کا آرزو مند۔ اس پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکّام پر مدار ہے۔ تو اُنکا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے۔ کہ نہ روپئے دیتے ہیں۔ نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں۔ نہ عتاب خیر اُس سے قطع نظر کی۔ اَب سنئے اِدہر کی۔ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر۔ عطیہ شاہی کا اُمیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔ اگر گنہگار ہوں۔ گنہگار ٹھہرتا۔ تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اِس بات پر کہ مَیں بے گناہ ہوں مقیّد اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہِ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا۔ بقلم چیف سکتّر اُس کا جواب پایا ہے۔ اگلی بار دلو کتابیں بھیجیں۔ ایک پیشکش گورنمنٹ۔ اور ایک نذرِ شاہی ہے۔ نہ اُسکے قبول کی اطلاع نہ اُس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب سر ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نفرمائی۔ اُن کی بھی کوئی تحریر مجکو نہ آئی۔ یہ سب ایک طرف۔ اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں۔ کہ چیف سکتّر بہادر لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا۔ کہ اُن کی جگہ کون سے صاحب عالی شان چیف سکتّر ہوے۔ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب صدر بورڈ میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا۔ کہ لفٹنٹ گورنری کی سکریٹری کا کام کس کو دے گئے۔ آپ کا حال کوئی نہیں کہتا۔ کہ آپ کہاں ہیں؟ ہاں ازروے قیاس جانتا ہوں۔ کہ آپ اُسی منصب۔ اور اُسی دفتر میں شاد و شاداں ہیں۔ جو آپ لفٹنٹی کے سکریٹری ہوے ہونگے۔ اُن سے علاقہ رہتا ہوگا۔ میور صاحب بہادر سے کاہے کو ملنا ہوتا ہوگا؟ لفٹنٹ گورنری اور صدر بورڈ یہ دونوں محکمے الہ آباد آگئے۔ یا آئیں گے۔ بہر حال۔ آپ اب کیوں آگرہ کو جائیں گے؟ نواب گورنر جنرل بہادر کی روانگی کی بھی خبر

میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ ۲۰ جنوری کو گئے۔ کوئی کہتا ہے۔ فروری میں کوچ فرمائیں گے میں اُدھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ ہر طرح اپنی قسمت کو رو بیٹھا۔ مگر یہ چاہتا ہوں۔ کہ حقیقت واقعی پر کما حقۂ اطلاع حاصل ہو تاکہ تسلی خاطر اور تسکین دل ہو۔ اگر ان مطالب کا جواب نہ مجمل بلکہ مفصل نہ دیں۔ بلکہ جلد مرحمت کیجئے گا۔ تو گویا مجھکو مول لے لیجئے گا۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ فقط۔

۲

پایانِ شب سیہ سپید است　　　در نومیدی بسے امید است

قبلہ! آج آپ کی خوشی و خوشنودی کے واسطے اپنی روداد لکھتا ہوں۔ ۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی اہالی دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا۔ کہ "میں بھی جاؤں"؟ فرمایا کہ "نہیں"۔ جب لشکر میرٹھ سے دلی آیا۔ میں موافق اپنے دستور کے روز ورود لشکر مخیم میں گیا میر منشی صاحب سے ملا۔ اُن کے خیمے میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں"۔ میں گدائے مبرم۔ اس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہونچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیجدیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ "اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو"۔ میں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا۔ اواخر ماہ گذشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب۔ دلی آئے۔ اہالی شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے

اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانہ محض اور مطرودِ حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا، کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ ۸ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکریٹری بہادر کے پاس بھیجا۔ بلا لیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں۔ جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ جملہ معترضہ۔ میر منشی لفٹنٹ گورنری سے سابقہ معرفت نہ تھا۔ وہ بطریق حسن طلب خیر خواہاں ہوئے۔ تو میں گیا۔ جب حکام بمجرد استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کرسکتا ہوں۔ کہ میر منشی کی طرف سے حسن خلق بایمائے حکام ہوگا۔ بقیہ روداد یہ ہے۔ کہ دوشنبہ مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ "تمھارا دربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے"۔ متحیرانہ میں نے پوچھا۔ کہ "حضرت! کیونکر؟" حضرت نے کہا کہ "حاکم حال نے ولایت سے آکر تمھارے علاقے کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے۔ اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا۔ کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے"۔ میں نے پوچھا۔ "کہ حضرت! یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟" فرمایا۔ کہ ہمکو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں۔ کہ "یہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۴ دن یا ۱۵ دن بعد ادھر کو روانہ ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا "سبحان اللہ"! شعر

کار سازِ ما بہ فکر کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

سہ شنبہ ۹ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھکو

بُلایا۔ خلعت عطا کیا۔ اور فرمایا۔ کہ لارڈ صاحب بہادر کے یہاں دربار خلعت بھی بحال ہے۔ انبالے جاؤگے تو دربار اور خلعت پاؤگے۔" عرض کیا گیا کہ "حضور کے قدم دیکھے۔ خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سُن لیا۔ یُوں نہال ہوگیا۔ اَب یہاں سے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا۔ تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا۔"

شعر

کارِ دنیا کسے تمام نکرد ہرچہ گیرید مختصر گیرید

بنام یوسف مرزا

کوئی ہے! ذرا یوسف مرزا کو بُلائیو! لو صاحب! وہ آئے۔ میاں! میں نے خط تمکو کل بھیجا ہے۔ مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے۔ اَب سُن لو۔ تفضّل حسین خاں اپنے ماموں مؤیّد الدین خاں کے پاس میرٹھ ہے۔ شاید دلّی آیا ہو۔ مگر میرے پاس نہیں آیا۔ والد آپکے غلام علی خاں اکبرآباد میں ہیں۔ مکتب داری کرتے ہیں۔ لڑکے پڑھاتے ہیں۔ روٹی کماتے ہیں۔ تم لکھتے ہو۔ کہ پچاس محل واجد علی شاہ کے کلکتے گئے۔ تمھارے ماموں محمد قلی خاں کے خط میں لکھتے ہیں۔ کہ شاہِ اودھ بنارس گئے۔ اس خبر کو اس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے۔ اِدھر سے آپ بنارس کو چلے ہوں۔ اُدھر سے بیگمات کو وہاں بُلایا ہو۔ مگر میری جان! ہمکو کیا ع عالم ہمہ مرگ ماچہ دریا چہ سراب ؏

۲

یوسف مرزا! کیونکر تجکو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا؟ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں؟ کہ اَب کیا کرو۔ مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ

ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے۔ اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا؟ صلاح اِس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کِس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہونگا۔ کہ یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں۔ کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوان مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی۔ نہ قیدِ فرنگ۔

نواب میر غلام بابا خاں

جناب نواب صاحب! میں آپ کے اخلاق کا شاکر۔ اور آپ کے یاد آوری کا ممنون اور آپ کے دوامِ دولت کا دعا گو ہوں۔ اگر بوڑھا اور اپاہج نہوتا۔ تو ریل کی سواری میں مقرر آپ تک پہونچتا۔ اور آپکے دیدار سے مسرّت اندوز ہوتا۔ آپ میرے شفیق اور میرے محسن ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت باکرامت رکھے۔ خط کے دیر دیر لکھنے کا سبب ضعف و نقاہت ہے۔ اگر میرے اوقاتِ شبا روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں۔ تو تعجّب کریں گے۔ کہ یہ شخص جیتا کیوں ہے صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا۔ اور پھر دم بدم پیشاب کو اُٹھنا اِن مجموع مصائب میں سے ایک ادنیٰ مصیبت یہ ہے ۱۲۸۳ھ ہجری شروع ہوئی ۱۲۱۲ھ کی ولادت ہے۔ اب کی رجب کے مہینہ سے سترّواں سال شروع ہوگا۔ ستّرا بہترا بوڑھا اپاہج آدمی ہوں۔ جو عنایت تم میرے حال پر

فرماتے ہو صرف تمھاری خوبی ہے۔ میں کسی لائق نہیں۔
نجات کا طالب غالب۔ چہار شنبہ ۳۱ر مئی ۱۸۶۷ء

بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکا

صبح جمعہ نہم شوال ۱۲۸۳ھ ۱۵- فروری ۱۸۶۷ء۔ بھائی میں نہیں جانتا۔ کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھکو تم سے اتنی محبت کیوں ہے۔ ظاہراً معاملہ عالم ارواح ہے۔ اسباب ظاہری کو اس میں دخل نہیں۔ تمہارے خط کا جواب مع اوراق مسودہ روانہ ہو چکا ہے۔ وقت پہ پہونچے گا۔ ستر ابہترا اردو میں ترجمہ پیر خرف کا ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے۔ پس میں اخرف ہوں۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ وہ بھی رفتہ رفتہ حافظہ کے مانند معدوم ہو گیا اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے۔ کہ جو دوست آتے ہیں۔ رسمی پرسش مزاج سے بڑھکر جو بات ہوتی ہے۔ کاغذ پہ لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے صبح کو قند اور بادام مقشر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سر شام تلے ہوئے۔ چار کباب۔ سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب۔ اور اسی قدر۔ گلاب۔ خرف ہوں۔ پوچ ہوں۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں۔ روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا حسب حال ہے۔

شعر

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہوں ہمارے کہ نہیں ہم

آج اس وقت کچھ افاقت تھی۔ ایک اور خط ضروری لکھنا تھا۔ بکس کھولا۔ تو تمہارا خط نظر پڑا۔ مکرر پڑھنے سے معلوم ہوا۔ کہ بعض مطالب کے جواب لکھے نہیں گئے۔ ناچار اب کتابت جداگانہ میں لکھتا ہوں۔ تاکہ

خلعت کا حال اور میرے اور حالات تم کو معلوم ہو جائیں۔ کہ میں قوم کا
ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں
ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ
نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ
اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا
ہنگامہ گرم تھا۔ وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبد اللہ خاں بہادر لکھنؤ
جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر
نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم
رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی
رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ اور راجہ بختاور سنگھ کا
نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ خاں بیگ بہادر
میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے
مجھے پالا۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں جب جرنل لیک صاحب کا عمل ہوا صوبہ داری
کمشنری ہو گئی۔ اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو
جرنل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو
سواروں کا بریگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور
لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی
کے تھے کہ بمرگ ناگہانی مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض
نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا۔ جو باپ
مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا۔ جو چچا مر گیا۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔ نواب
گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست

کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے۔ اور جیغہ سرپیچ۔ مالائے مروارید۔ تین رقم خلعت ملا۔ ازاں بعد جب دلی میں دربار ہوا۔ مجھکو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ۔ دربار و مصاحبت دونوں بند ہو گئے۔ میری بریت کی درخواست گزری۔ تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس کے بعد پنڈ چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا۔ غرض کہ خلعت ریاست کا ہے۔ عوض خدمت نہیں۔ انعامی نہیں۔ مستہج الذہن نہیں ہوں۔ غلط فہم نہیں ہوں۔ بدگمان نہیں ہوں۔ جو جس کو سمجھ لیا۔ اس میں فرق نہیں آتا۔ دوست سے راز نہیں چھپاتا۔ کسی صاحب نے حیدر آباد سے گمنام خط ڈاک میں بھیجا۔ بند بڑی طرح کیا تھا۔ کھولنے میں سطر کٹ گئی۔ بارے مطلب ہاتھ سے نہیں جاتا رہا۔ بھیجنے والے کی غرض یہ تھی۔ کہ مجھکو تم سے رنج وملال ہو۔ قدرت خدا کی۔ کہ میری محبت اور بڑھ گئی۔ اور میں نے جانا کہ تم مجھے دل سے چاہتے ہو۔ وہ خط بجنسہ تمہارے پاس اس خط میں ملفوف کرکے بھیجتا ہوں۔ زنہار دستخط کو پہچان کر کاتب سے جھگڑا نہ کرنا۔ مدعا اس خط کے بھیجنے سے یہ ہے۔ کہ تمہاری ترقی منصب اور افزونی مشاہرہ اس خط سے مجھے معلوم ہوئی تھی۔ فقط

نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام

کیونکر کہوں۔ میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں۔ اتنے ہوش باقی ہیں۔ کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ یہ کیا ہوشمندی ہے؟ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں۔ نہ القاب نہ آداب۔ نہ بندگی۔ نہ تسلیم۔ سن غالب ہم تجھ سے

کہتے ہیں۔ بہت مصاحب نہ بین۔ ایاز قدرِ خود بشناس۔ مانا کہ تونے کئی برس کے بعد رات کو ۹۹ نو نو بیت کی غزلیں لکھی ہیں۔ اور آپ اپنے کلام پر وجد کرتا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھ۔ پھر بندگی عرض کر۔ پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ۔ پھر عنایت نامے کے آنے کا شکر ادا کر۔ اور یہ کہہ کہ جو میں تصور کر رہا تھا۔ وہ ہوا۔ یعنی جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا۔ اُسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہونچا۔ معلوم ہوا۔ کہ حرارت ہنوز باقی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رفع ہو جائیگی۔ موسم اچھا آگیا ہے۔ اگر صرف بتبرید تعدیل سے کام نکل جاے۔ تو کیا کہنا۔ ورنہ بحسب رائے طبیب تنقیہ کرائیے۔ مجکو بھی آج دسواں منضج ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔ شب کو ناگاہ ایک زمین نئی خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی۔ غزل تمام کی۔ اُسی وقت سے یہ خیال میں تھا۔ کہ کب صبح ہو۔ اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیجدوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں۔ اور میرے قبلہ جناب میر امجد علی صاحب کو سناویں۔ اور میرے شفیق منشی نادر حسین خاں صاحب اور اُن کے بھائی صاحب اِس کو پڑھیں۔ پروردگار اِس مجمع کو سلامت رکھے! فقط۔

پیرو مرشد! شب رفتہ کو مینہ خوب برسا۔ ہوا میں فرطِ برودت سے گزند پیدا ہوگیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابر تنک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے۔ پر نظر نہیں آتا ہے۔

مولنا غلام امام شہید

شاہ غلام محمد کے بیٹے۔ قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔

ہندوستان کے مشہور شاعر۔ مدّاحِ نبی۔ عاشقِ رسول کے لقب سے مشہور تھے نظم میں **قتیل** اور **مصحفی** کے شاگرد تھے۔ علوم متداولہ کی تحصیل مولوی حیدر علی صاحب کی خدمت میں کی تھی۔ فارسی زبان خوب جانتے تھے۔ فارسی نظم و نثر میں **آغا سیّد اسمعیل مازندرانی** کے شاگرد تھے۔ سرکار نظام سے چارسو تیس روپیہ سال بلا شرطِ خدمت مقرّر تھے۔ وہ آخر وقت تک پاتے رہے۔ آپ کے آبا و اجداد سب گوشہ نشین اور قناعت گزیں تھے۔ **لکھنؤ** کے اطراف میں اور **آگرہ**۔ **مراد آباد۔ رام پور۔ حیدر آباد۔ الہ آباد** میں آپ کے مرید بہت تھے۔ **سرسالار جنگ بہادر نواب کلب علی خاں بہادر رئیس رام پور۔ سعید عالم خاں رئیس سورت** اور اکثر امرا و رؤسا آپکی بڑی عزت کرتے تھے۔ پیرانہ سالی میں آپ نے انتقال کیا **اردو** نظم اور نثر رنگین جیسا کہ اس زمانے کا رواج تھا۔ بچّی لکھتے تھے۔ کلام اپنا کبھی جمع نہیں کیا۔ **مجموعۂ میلاد شریف** اور **انشاے بہار بیخزاں** اور قصائد غزلیات کا ایک مجموعہ آپ کی یادگار ہے۔

تاج گنج کے روضے کی تعریف

آج قلم کا دماغ پھولوں کی خوشبو سے معطّر ہے۔ کاغذ کا صفحہ آنکھ کی سفیدی کی طرح منوّر ہے۔ نظر کا ڈورا رگِ گل کی طور پر رنگین ہے۔ نگاہ کا رشتہ گلدستہ کے مانند بہاریں ہے۔ کس واسطے ؟ کہ مجھے ایک باغ اور مکان کی صفت لکھنی منظور ہے۔ جس کی سیر سے چشمِ مردم میں نور ہے۔ اس کے صحن اور دالان میں خدا کی قدرت کا گل کھلا ہے۔ چمن اور میدان میں صانع کی صنعت کا تماشا ہے۔ وہ کون مکان ؟ اور کیسا گلستان ؟ جو شاہجہاں

ایسے بادشاہ عالی جاہ کا قیام گاہ ہے۔ کون قصر؟ اور کیسا ایوان؟ جو جناب
عالیہ بادشاہ بیگم کا آرامگاہ ہے۔ جس جگہ یہ دونوں آفتاب ماہتاب سوتے
ہیں۔ چاند اور سورج دن رات اُس زمین کے نثار ہوتے ہیں تاج بی بی کا
روضہ جہاں میں مشہور ہے۔ اور ہر چمن اُس کا جنت کی خوشبو سے معمور
ہے۔ اکبر آباد کیا۔ بلکہ سارے ہندوستان کو اِس مکان سے عزّت ہوئی ہے
ہندوستان کیا بلکہ تمام رُوے زمین کو اُس سے زینت ہوئی ہے۔ اِس چمن
کی ہوا نے جو کلیوں کی بُو باس سے خیال کے دماغ کو معطّر کر دیا۔ تو باغ کی
فضا نے دامنِ نظر کو گلچیں کے دامن کی طرح پھولوں سے بھر دیا۔

سبحان اللہ!۔ کیا روضہ ہے؟۔ کہ رضوان جس کے لطف و لطافت
سے راضی و خوشنود ہے۔ بارک اللہ! کیا باغ ہے! جس میں بہشت کی ہر نعمت
موجود ہے۔ سورج اِس باغ کا ایک زرد آلو ہے۔ چاند اِس چمن کا گل شبو
ہے۔ پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اوپر
اُٹھائے۔ تو اُس کو آفتاب کی پگڑی سنبھالنی دشوار ہو جاے۔ دونوں بازو کے
سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ چوب قلم سے جو لکھا
ہے۔ عقل اِس طلسمات سے حیران ہے۔ کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا
ہے۔ ویسا دُور سے دکھائی دیتا ہے۔ اِس فن کے بصر انصاف سے دیکھیں۔
کہ یہ بات کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیم کا حل ہے۔ سنگِ مرمر پر
سنگِ موسے کی پچّی کاری کہئے یا آنکھ کی سفیدی پر پتلیوں کی سیاہی کی
نمو داری۔ حرف ہیں۔ یا کافور کے قرص پر مشک کے دانے پڑے ہیں۔
لفظ ہیں۔ یا ہیرے کی تختی پر نیلم کے نگینے جڑے ہیں۔ مینار آسمان کی
طرف تعجب کا ہاتھ اٹھائے ہے کہ یہ خم دیکھیے۔ اور اِس بارگاہ کے ساتھ

ہمسری کا دعویٰ اور دم دیکھئے۔ محراب کا خم ابرو سے اشارہ کر رہا ہے کہ اندر جا کر ذرا بہار کا عالم دیکھئے نہیں! نہیں! غلطی ہوئی مجھ سے بلکہ محراب کا اشارہ یہ ہے۔ کہ پہلے حواس کو یہاں طاق پر رکھ جایئے۔ تب آگے قدم بڑھائیے۔ پس جو اُدھر چوکھٹے لانگنے کی عزمیت ہوئی۔ تو اِدھر عقل اور علمیت رخصت ہوئی۔ سیر سے سیر ہونا تو نگاہ کے ہاتھ ہے۔ لیکن حیرت یہاں ہر قدم کے ساتھ ہے۔ سب کے پہلے بہار کے علمدار بڑی شوکت اور شان کے ساتھ نظر پڑتے ہیں۔ یعنی دورویہ سرو کے درخت نیک بخت جوان کی طرح حسن کے جوبن سے اکڑتے ہیں۔ زمرد کی جھاڑ کی تو کیا حقیقت ہے؟ جو اس کے ساتھ تشبیہ دوں۔ مگر ہاں لکھوں۔ تو یوں لکھوں۔ کہ اچھے اچھے سبز پوش ہر قطار میں کھڑے ہو کر ناز و انداز سے انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ یا غلمان بہشت سے آکر آسمان کو اِس باغ کی خوبیوں کی خبر دے رہے ہیں۔ نشو و نما جو ہر چیز کو بڑھاتی ہے شاید سروہی کے لباس میں کمربستہ یہاں آئی ہے۔ یا آب و ہوا کی لطافت سے سرو کے پردے میں آپ ہی بڑھی جاتی ہے۔ دونوں قطار کے درمیان جو ایک حوض زمین دوز اور طویل ہے۔ گویا فی سبیل اللہ سلسبیل ہے۔ صاف پانی سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں ہر سرو کے مقابل ایک ایک فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ اُدھر سرو نے زمرد کے فوارہ کا نقشہ اُڑا لیا۔ اِدھر پانی کے فوارے نے ہیرے کو پانی کر کے بہا دیا۔ بعد اس کے ایک مربع حوض جو بہت ستھرا ہے۔ نہایت خوبصورت اور خوشنما ہے۔ آئینہ اُسے دیکھ حیرت میں آتا ہے۔ نگاہ کا قدم پھسلا جاتا ہے۔ بہشت کی نہر اُس کا خزانہ ہے۔ آئینہ اُس کا آبدار خانہ ہے بلکہ آئینہ میں یہ

روانی کہاں ؟ - اور وہ موجوں کی سلسلہ جنبانی کہاں ؟ پانی اُس کا دودھ
سے زیادہ مصفّا ہے - برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے - چونہ جو شیر خشت
ہو جائے تو روا ہے - پتھر جو یخ در بہشت بن جائے - تو بجا ہے - چاروں
طرف سے فوّارے چھوٹتے ہیں - گویا آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں - پانی کی
زمین سے پانی کا درخت نکلنا - اور پانی ہی کے پھل پھول سے پھولنا -
پھلنا - خدا کی قدرت ہے - آئینے کے چشمے سے موج کا کھڑے ہو کر چلنا -
اور ہوا کے ساتھ زور کر کے اُچھلنا عجب حکمت ہے - عقل نے جب فکر
کے دریا میں غوطہ لگایا - تو روضے کے اُدھر حوض کے واقع ہونے کا
سبب یوں سمجھ میں آیا - کہ نگاہ پہلے اُس میں نہا کر پاک ہوے -
تب روضے کے طواف کی آرزو کرے - اور ناطقہ پہلے اُس کے پانی سے
کلیاں کر کے مُنہ صاف کر لے - تب بہار کی صفت میں گفتگو کرے - اِس
حوض کی یاد میں دریا کی پسلی پھڑکتی ہے - سینے میں آگ بھڑکتی ہے -
جوش کھا کر دیکھنے آتا ہے - مگر دیوار سے سر ٹکرا کر پھر جاتا ہے - جس
طرف آنکھ اُٹھائیے - اور جدھر خیال دوڑائیے - بیلا - چنبیلی - موتیا - موتیا
چنپا - جوہی - کیتکی - کیوڑا - گلاب - سدا بہار - گیندا - داؤدی - گُل عباس
گُل مہندی - نازبو - گُلِ رعنا - گُلِ فرنگ - گُلِ چاندنی - شبّو - کلغا - سیوتی -
دوپہری - سورج مُکھی - لالۂ نافرماں - سوسنِ ہزار زباں - نرگسِ حیراں -
قسم قسم رنگ برنگ کے پھول پھول رہے ہیں - پیارے سہانے درختوں
پر صبح شام کی دھوپ چھاؤں کا عالم - پتّوں پر شبنم کی طراوت اور
نم - ڈالیوں پر چڑیوں کا غُل - پریوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ چہل - اور
جوانوں کے غول - ہمجولیوں کی ہنسی اور ٹھٹھول - کہیں گُل کے قہقہے

کہیں بلبل کے چہچہے ہیں۔ مور اُدھر شور کرتا ہے۔ اِدھر مستوں کا جنوں زور کرتا ہے۔ کوئل وہاں کوک اُٹھتی ہے۔ سینے میں یہاں ہوک اُٹھتی ہے پپیہا جو اُدھر بولا۔ پی کہاں! تو یہاں بدن میں جی کہاں؟ ڈیڑھ کی اُدھر نئے نئے طور پر دُھن ہے۔ اِدھر حیات کے جامے کی اُدھیڑ بُن ہے۔ طوطی کی جو بات ہے۔ گویا نبات ہے۔ مینا کو شیریں کلامی سے کام ہے ناکامی کا کام ہی تمام ہے۔ جگنو کا چمکنا۔ باغ کا مہکنا۔ دونوں وقت کا ملنا۔ شبو کا لہکنا۔ سنبل کا بال بکھیرنا۔ مچھلیوں کا حوض میں تیرنا ہوا کا چلنا۔ دل کا مچلنا۔ سبزی کا لہلہانا۔ چڑیوں کا چہچہانا۔ شفق کا پھولنا۔ گلزار خیال کا تماشا دکھاتا ہے۔ یہ سماں دیکھکر کوئی پھول سا پھولا نہیں سماتا۔ کوئی بوئے گل کی طرح گریبان پھاڑکر نکلا جاتا ہے۔ بیلا بے لاگ دل کو کھینچتا ہے۔ چنبیلی کی البیلی وضع پر روح شیدا ہے۔ منہدی کی ٹٹیوں پر چاندنی لوٹ پوٹ ہے۔ جس کی بہار سے چاند کے جگر میں داغ اور دل پر چوٹ ہے۔ لالہ لعل سے بہتر۔ سبزہ زمرد کا ہمسر۔ کیاریوں کے کنارے کی ہری دوب کا شائی مخمل سے زیادہ خوب و مرغوب درختوں کے تھالے ہیں۔ یا دودھ کے بھرے ہوئے پیالے ہیں۔ آبشار ہے۔ یا آئینہ پشت بدیوار ہے۔ پانی کی چادر پر جو نقش و نگار ہے۔ قلم قدرت کا یادگار ہے۔ نہر کی جو ایسی اٹکھیلیوں کی چال ہو۔ تو دل کیونکر نہ پامال ہو؟۔ مہتاب سرو کے ساتھ ہم آغوش ہے۔ یا کوئی جوان سبز رنگ بادلہ پوش ہے۔ گلنار کو دیکھکر لعل انگاروں پر لوٹتا ہے۔ سبزے کے رشک سے زمرد زہر کھاتا ہے۔ یہ لالے ہیں۔ یا آتش کے پرکالے ہیں جس کے دیکھنے سے جلنے کے لالے پڑتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں داغ بڑھتے

ہیں۔ چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا ہے۔ یا سبز مخمل پر منقیش کتر کے
چھڑک دیا ہے۔ کلغے کو قلم کرکے ایسا برابر کیا ہے۔ کہ اُس کے پتّے اور
پھولوں سے گویا سبز اور سرخ بوٹیوں کا غالیچہ بچھا دیا ہے۔ مولسری کی
بھینی بھینی خوشبو ہے۔ تو صبا کو اِسی کی جستجو ہے۔ یہ ہارسنگھار کی کلکاریاں
ہیں۔ یا آگ کی چنگاریاں ہیں۔ بیر بہوٹیاں رینگتی ہیں۔ یا یاقوت کا خون
بہ چلا۔ لالہ نار چمن میں کھلا۔ یا چنار سے شعلہ نکل پڑا۔ اگر آب و ہوا
کی لطافت یہی ہے۔ تو موتی صدف سے نکل کر کلیوں کا روپ دکھلائیگا
اور مچھلی کا کانٹا سرسبز ہو جائیگا۔ میوے کا نام زبان پر آیا۔ اور حلاوت
کے منھ میں پانی بھر آیا۔ کولا۔ سنگترہ۔ رنگترہ۔ چکوترہ۔ نارنگی۔ لیمو۔ زرد آلو
شفتالو۔ انار۔ سیب۔ بہی۔ انگور۔ انناس۔ ناشپاتی۔ کیلا۔ بیر۔ کمرکھ۔ شریفہ۔
کٹھل۔ بڑہل۔ انبہ۔ املی۔ جامن۔ پھلیندار۔ امرود۔ شہتوت۔ پونڈا۔ کھرنی۔
کوئی پھل ایسا نہیں۔ جو اِس باغ میں نہ ہوتا ہو۔ اور ساگ ترکاری سے
لیکر جڑی بوٹی تک کوئی ایسی شے نہیں۔ جسے باغباں نہ بوتا ہو کہیں کولے
سنگترے سے چمن کا چمن آگ بھبھوکا ہو گیا۔ کہیں فالسے کی رنگت سے زمین کا
دامن اُودا ہو گیا۔ سیب سے آسیب کی زحمت دفع ہو جاتی ہے بہی بدن
میں فربہی لاتی ہے۔ ناشپاتی سے روح راحت پاتی ہے۔ انار نے خلق کے منھ
یاقوت اور موتیوں سے بھر دئے۔ نازنینوں کے دانت کھٹّے کر دئے۔ ادنیٰ
میوہ یہاں کا اخروٹ ہے۔ جسپر ستاروں کا دل لوٹ پوٹ ہے۔ آسمان دن
رات سنو طرح تاک جھانک میں رہا۔ تب انگور کی ٹٹی سے ایک خوشہ
پروین کا کچّا لے بھاگا۔ سو باوصف اِس پختہ کاری کے اب تک پکا نہ سکا۔
کیلا یہاں ایک ایک گود میں ہزار ہزار پھلتا ہے۔ ماہ نو وہاں آسمان پر

اکیلا نکلتا ہے۔ اِس زمین کا اگر خربزہ یا سردا ہے۔ پوست میں مغز اُس کا تر
حلوا ہے ہندوانہ مرغِ روح کا آشیانہ ہے۔ جس میں ایک ہی جگہ موجود
آب و دانہ ہے۔ شہتوت تمام عالم کا قوت۔ انجیر بالکل شکر و شیر۔ امرود حلوائے
بے دود۔ انبہ نازنینوں کے ہونٹوں پر مُہرِ خاموشی ہے۔ کہ میرے سامنے شیرینی
کا دعویٰ ناحق کوشی ہے۔ دوات قلم کی زبان چوستی ہے۔ گویا نے شکر ٹھہرایا
قلم کاغذ کو چاٹتا ہے۔ آپ چیونٹا بنا۔ اور اُس کو مصری بنایا۔ قاف ڈالیاں
سروں پہ لیئے جا بجا کھڑے ہیں۔ انعام کے لیئے اڑے ہیں۔ کوئی پھولوں
کا ہار لاتا ہے۔ کوئی گلدستہ دور سے دکھاتا ہے۔ پھر جو روضہ نظر آیا۔ تو
وہ سماں آنکھوں میں سمایا۔ کہ نہ دیدے نے خواب کی آنکھوں سے کبھی دیکھا
نہ شنید نے خیال کے کانوں سے کہیں سُنا الٰہی! یہ روضہ ہے۔ یا خلد بریں
آسماں ہے یا زمیں۔ سنہرا کلس ہے۔ یا سورج کی کرن۔ گنبد ہے۔ یا نور کا
مسکن۔ قبرستان ہے۔ یا روضۂ رضواں۔ مکان ہے یا جواہرات کی کان ہے۔
جو پتھر ہے۔ جواہرات سے بہتر ہے۔ صبح نے مر مر کے ایسی صفائی پائی۔ تب
سنگ مرمر کی صورت بنائی۔ سنگ موسیٰ کو شعلۂ تجلّی نے طور پہ جلایا۔ تب
اِس درگاہ کے صرف میں آیا۔ کلس کا سایہ دریا میں ایسا رہتا ہے۔ جیسا تہِ
آبی میں آفتاب۔ حوض میں چاند ایسا نظر آتا ہے۔ جیسا دریا میں حباب
دیواریں میں منھ نظر آتا ہے۔ گویا آئینہ ہے۔ جلا کیا ہوا۔ گنبد سے دماغ تازہ
ہوتا ہے۔ گویا قرابہ ہے۔ گلاب سے بھرا ہوا۔ صبح کی طباشیر استرکاری کے
صرف میں لائی گئی۔ جو اب تک وہی نور کا عالم دکھاتی ہے۔ رات کا مشک
اور شفق کی زعفران پیس کر گارے میں ملائی گئی۔ جو آج تک دنیا خوشبو
دماغ میں آتی ہے۔ آفتاب کے ترنج کا عرق نچوڑ کر ماہتاب کے پیالے

ہیں موتی کی آب سے ملایا تھا۔ جو چونے میں یہ نور اور ایسی صفائی ہے۔
بہشت کے کافور کو شفق کے ساتھ آفتاب کے کھرل میں پیس کر صبح کے
دامن میں چھانا تھا۔ جو رنگ نے یہ آب و تاب پائی ہے۔ جالیوں کی
نزاکت میں عقل کام نہیں کرتی۔ کہ پتھر کو موم کرکے بال کا قلم پار
کر دیا۔ یا خیال کا جالا سمجھکر نگاہ کی نوک سے جیسا چاہا کام بنالیا۔ پھر ایک
جالی میں وہ ملاحت ہے۔ کہ دیکھنے میں پتھر کی حالت ہے۔ کاغذ کی جلی
پر حرفوں کا ابھار پن تو معلوم بھی ہوتا ہے۔ یہاں پتھر کی پچی کاری
کا نہ جوڑ نظر آتا ہے۔ نہ پیوند۔ اور نہ جوڑ کہیں سے پست ہے۔ نہ بلند
بس کر شہید! بس کر۔ آپ گفتہ کی مست ہوس کر۔

رقعہ تہنیت و تعزیت آمیز

مجموعۂ انشاے شیریں زبانی۔ دیباچۂ کتاب سخن معانی زاد مشتمۂ۔
قلم بعد تشریح مراتب اشتیاق و آرزو مندی کے تعزیت کے مضمون سے آنسو
بھی بہاتا ہے۔ اور کچھ خوشی میں آکر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے
زمانے میں خوشی و غم دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ اور دنیا میں
دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ دو پھول
ایک ہی شاخ میں پھوٹتے ہیں۔ ایک دولہا دولھن کے سہرے کے کام آتا
ہے۔ دوسرا میت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے۔ دو موتی ایک سیپ میں
پیدا ہوتے ہیں۔ ایک کو بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں۔ دوسرے کو کھرل
میں پیسکر دوا میں ملاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بنتی ہیں۔ ایک
محفل سرود کے کام آتی ہے۔ دوسری مردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے۔

چمن میں کلی اگر کھل کھلا کر ہنستی ہے۔ تو شبنم بے اختیار اس کے ہنسنے پر روتی ہے۔ جس باغ میں خزاں ہو۔ وہاں بہار بھی ہے۔ اور جہاں گل ہو۔ وہاں خار بھی ہے۔ بادام کے پوست اور مغز کو دیکھئے۔ کہ نرمی اور سختی ایک ہی جگہ نمود ہے۔ برف کو سوچئے۔ تو گرمی اور سردی اس کے ساتھ ہی موجود ہے۔ سرخی اور زردی گلِ رعنا کی دلیل ہے۔ تقدیر نے اگر صبح کو لباس سفید خوشی کا پہنایا۔ تو شام کے واسطے جامہ سیاہ ماتمی بنایا۔ حاصل یہ کہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا۔ گویا اسی گردشِ لیل و نہار کی خزاں و بہار کا تماشا دکھایا۔ اور اس غم نے جتنا رولایا تھا۔ آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسایا۔ اس افسوس میں آسمان جو ماتمی لباس پہنے نظر آیا۔ تو شفق کی سرخی نے وہیں خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ رنج میں دو ہتڑ پہلے منھ پر مارا۔ تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اٹھا کر یوں دعا مانگی۔ کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ اور آپ سلامت رہیں اور یہ شادی مبارک ہو۔ بندہ بھی ادائے رسم فاتحہ خوانی و شرکت محفل شادمانی کے واسطے ضرور حاضر ہوگا۔ زیادہ والسلام۔

آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں بہادر

پیدائش دہلی ۱۸۱۷ء — وفات علی گڑھ ۱۸۹۸ء

سرسید ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ علوم دینیہ کی تحصیل کے بعد ۲۲ سال کی عمر میں ابتداءً دہلی کی صدر امینی کی کچہری میں سررشتہ دار مقرر ہوئے اس کے بعد کمشنری آگرہ میں نائب منشی ہوئے۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری

کے منصف ہوئے۔ وہاں سے فتحپور سیکری پھر دہلی آئے۔ ۱۸۵۵ء میں بجنور کے مستقل صدر امین ہوئے۔ ۱۸۵۸ء میں مراد آباد کے صدر الصدور (سب جج) مقرر ہوئے۔ وہاں سے غازی پور، علی گڑھ، بنارس میں سب جج کے عہدہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے ولایت روانہ ہوئے۔ ۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان واپس آکر ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ کے دربار سے آپ کو جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۰ اگست ۱۸۶۹ء کو سرکار انگلیشیہ سے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ ۱۸۷۶ء میں پنشن لیکر اپنی زندگی کو اپنی قوم کے لئے وقف کر دیا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء بمقام علی گڑھ ۸۱ برس کی عمر میں آپ نے انتقال فرمایا۔ اور اپنے قائم کئے ہوئے کالج کی مسجد کے بیرونی حصے میں دفن ہوئے۔

سرسید نے ۱۸ یا ۱۷ برس کے سن سے مضامین لکھنے شروع کئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء تک انکا طرز تحریر زمانے کے قدیم روش کے موافق تھا۔ مگر اس وقت میں بھی سادگی اور بے ساختگی انکی تحریر میں پائی جاتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے آپ نے اپنا طرز تحریر بالکل بدل دیا۔

سرسید کے کلام میں تشبیہیں۔ استعارے۔ کنائے۔ مثلیں۔ تلمیحیں۔ نہایت لطیف ہیں۔ قدرت بیان حد سے زائد ہے۔ ا۔ سرسید کے قلم میں ہر مطلب کو اس کے مناسب پیرایہ میں بیان کرنے کی بیحد قابلیت تھی۔

۲۔ اور مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطالب کو اس طرح سلجھا کر ادا کر جاتے کہ جو مضمون لفظوں میں سماتا نظر نہ آتا ہو۔ وہ ایسی خوبی سے ادا ہو جاتا جیسے انگوٹھی پر نگینیں جڑ دیا ہو۔

۳۔ واقعات اور حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچتے کہ جو برائیاں

بسبب۔ الفت و عادت کے دلوں میں کُھپ گئی ہوں۔ اُن کی بُرائی اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چُھپ گئی ہوں۔ اُنکی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔

مولانا حالی اپنی کتاب حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں کہ "سر سید نے اُردو زبان اور اُردو لٹریچر کو طرح طرح کی مدد پہونچائی ہے۔ مگر جو بے بہا مدد خاصکر اُنکے لٹریری ورکس سے اُردو لٹریچر کو پہونچی ہے۔ اُس کے لحاظ سے اُن کو فادر آف اُردو کہنا کچھ مبالغہ نہیں"۔ سید کے طرزِ تحریر میں یہ خصوصیت تھی کہ اُس کی لطافت اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اُس کو شوق اور توجہ سے پڑھتے تھے۔ اور اُس کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی لکھنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ اس لئے جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شائستگی اور گھلاوٹ عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ اور مضمون نگاری کا جو سلیقہ اخباری دُنیا میں پھیلا ہے۔ یہ سب اُسی ایک قلم کی آواز بازگشت ہے۔ سب سے زیادہ زور دار اور با اثر آپ کی اسپیچیں ہوتی تھیں۔ مگر وہ اکثر پولیٹیکل یا مذہبی معاملات پر ہیں۔ اس لئے اِس انتخاب میں لانیکے لائق نہیں

آپ کی علمی تصانیف سے سلسلۃ الملوک۔ آثار الصنادید۔ اسباب بغاوتِ ہند وغیرہ اور لکچروں کا مجموعہ۔ اور صدہا مفید مضامین یادگار ہیں۔ جو تہذیب الاخلاق اور علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھپے ہیں +

اپنی مدد آپ

خدا اُنکی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جوش اُس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جبکہ یہ جوش بہت سے

شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جبکہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اُس شخص میں سے یا اُس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہوجاتا ہے۔ اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اُس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اُسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اُسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے ازخود جاتی رہتی ہے۔ اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے عزت ہوجاتی ہے۔ آدمی جسقدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پہ کیوں نہ کریں یہ امر بدیہی اور لابدی ہے کہ وہ اُسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہموطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہ سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی اور بہبود کا خیال کر کر ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔ ایک شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آبرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہوجاوے۔ یا کلکتہ میں ویسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہوکر کیوں نہ بیٹھ جاوے۔

قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتا ہے۔ اِس وقت یہ رسم ہیں
کسی بات پر ووٹ دینے سے گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے
کیوں نہ دیا ہو قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ بلکہ خود اُس کی چال چلن پر
اُس کے برتاؤ پر بھی اُس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ
پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسانوں
کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ
ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قویٰ کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی
کر سکتا ہے۔

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت
مثبت اور مستقل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے۔ اور وہ فرض جان
و مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جبکہ قانون کا عملدرآمد دانشمندی سے
ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ
اٹھا سکتا ہے۔ جسقدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اُتنا ہی ذاتی
نقصان کم ہوتا ہے۔ مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی اُبھارنے والا کیوں
نہ ہو۔ سست آدمی کو محنتی۔ فضول خرچ کو کفایت شعار و شراب خوار
کو تائب نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ باتیں شخصی محنت۔ کفایت شعاری نفس
کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی۔ قومی عزت۔ قومی اصلاح۔
عمدہ عادتوں۔ عمدہ چال چلن۔ عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے۔ نہ گورنمنٹ
میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حاصل کرنے سے۔

پُرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ" اگر اس
مقولہ میں "اَلنَّاس" سے چند خاص آدمی مراد لئے جائیں تو جو بادشاہ کے

مقرب ہوتے ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے - اور اگر یہ معنی لیے جائیں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے - رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی - بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے - نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً اُن لوگوں کا جنپر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے - جو رنگ انکا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے - جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شایستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اُسکو زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے - اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شایستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھنچ جاتی ہے - تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا - انگلستان کی رعایا تہذیب و شایستگی میں اُس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی اُس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا - ہندوستان کی رعایا تہذیب و شایستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے - گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھنچتی - بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لاتی ہے ۔

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے ٹھیک اُسی کے موافق اُس کے قانون اور اُسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے - جس طرح کہ پانی خود اپنی ڈھال میں آ جاتا ہے اُسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے - اور جاہل اور خراب اور ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے ۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی و قدر

منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اُس ملک کی رعایا کے چال چلن۔ اخلاق و عادت۔ تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے۔ اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت اُن مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت۔ شخصی عزت۔ شخصی ایمانداری شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی۔ شخصی بے عزتی۔ شخصی بے ایمانی۔ شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی۔ یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے درحقیقت وہ خود اُسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے اُن برائیوں کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اُس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جائیگی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اُسکا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو۔ تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا۔ بات چیت کا۔ وضع و لباس کا۔ سیر سپاٹے کا۔ شغل و اشغال کا تمہاری اولاد کے لئے ہے اُس سے اُن کی شخصی چال چلن۔ اخلاق و عادات۔ و نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلا۔

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی

اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جسکو ایک ناخدا ترس نے جو اسکا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید کیا ہے۔ یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ اصلی غلام ہے جو بد اخلاقی۔ خود غرضی۔ جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پرواہ ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہوسکتیں۔ جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے اُس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ گو کیسے ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جائیں۔ وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

مستقل اور مضبوط آزادی سچی عزت۔ اصلی ترقی۔ شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے۔ اور وہی شخصی چال چلن معاشرت و تمدن کا محافظ۔ اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے جان اسٹورٹ مل جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گزرا ہے اُسکا قول ہے کہ "ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر اُس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے۔

اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی شے اُس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے۔ پھر اُس شے کو جس نام سے چاہو پکارو۔ اُسی مقولہ پر میں اسقدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے وہاں کیسے ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جاوے وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کرسکتی۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کردے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اسکو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کردے۔ اور آدمیوں کو انسان پرست بنادے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے۔ اور اُس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں۔ جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہوجاتا ہے۔

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اُس کو اچھی طرح سمجھیں گے۔ اور کام میں لائینگے تو پھر خضر کو ڈھونڈتا بھول جائینگے اوروں پر بھروسا اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے۔ اور پہلا خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمائشگاہ دستکاری میں کہا تھا۔ جو ایک بڑا خیرخواہ آیرلینڈ کا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ "جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اُسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کیلئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں۔ مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت۔ ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جائیں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پہ استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہمکو کوئی موقع یا آئندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی ولولہ اور محنت سے کام کئے جائینگے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہوجائیگی"۔

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں۔ زمین کے جوتنے والوں۔ کانوں کے کھودنے والوں۔ نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں۔ مخفی باتوں کو ڈھونڈھ کر نکالنے والوں۔ آلات جرثقیل سے کام لینے والوں۔ اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں۔ ہنرمندوں۔ شاعروں۔ حکیموں۔ فیلسوفوں۔ ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسرے نسل کی محنت پہ عمارت بنائی ہے۔ اور اُس کو ایک اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں۔ لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم اور ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی ایک ترتیب پیدا

ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اُس زرخیز اور بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے بزرگوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیّا ہوئی تھی۔اور وہ جائداد ہمکو اِس لئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مارسرگنج اُس کی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ ہم کو اِسلئے دی گئی ہے کہ اُسکو ترقی دیں۔اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں۔مگر افسوس کہ ہماری قوم نے اُن بزرگوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرادیا۔

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دور میں اِسقدر ترقی ہوئی اُس کا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ اُن کی قوم میں اپنی آپ مدد کرنے کا جذبہ رہا ہے۔اور اُس قوم کی شخصی محنت اُس پر گواہ عادل ہے۔یہی مسئلہ اپنی آپ مدد کرنیکا انگریزوں کی قوم کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے۔

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور بہت زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے۔لیکن کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے بھی اُس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔گو کسی اور لڑائی میدانِ کارزار کی فہرستوں اور تاریخوں میں بڑے بڑے جرنلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں لیکن وہ فتوحات اُن کو زیادہ تر اُنھیں محنتی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب ہوئی ہے۔عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں۔بہت سے ایسے شخص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا۔لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی پر اُن کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے جیسا کہ اُن خوش نصیب مشہور نامور آدمیوں کا ہوا ہے

جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں۔
ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے اُس شخص کا اُس کے زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اُس کے ملک اُس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے۔ اور آئندہ نسل کے لیے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔
ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے۔ اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔ اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب اور مدرسے کی تعلیم اسی عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ سے علم کا جس کو انگریزی میں "لیف ایجوکیشن" کہتے ہیں انسان پر۔ قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب اور مدرسہ کا علم طاق میں یا صندوق میں یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں۔ گھر کے رہنے سہنے میں۔ شہر کی گلیوں میں پھرنے میں صراف کی دوکان کرنے میں۔ ہل جوتنے میں۔ کپڑا بننے کے کارخانہ میں۔ کلوں سے کام کرنے کے کارخانہ میں اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کئے۔ لوگوں میں صرف اُس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔
پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اس پچھلے علم

سے عمل - چال چلن - تعلیم نفسی - نفس کشی - شخصی خوبی - قومی مضبوطی - قومی عزت حاصل ہوتی ہے - یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے - اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا - اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے - لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ "علم سے عمل نہیں آجاتا - علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے - اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اُس کے علم کو باعمل یعنی اُس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے - علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن کے آدمی کو زیادہ ترمعزز اور قابل ادب بناتا ہے -

(سرسیّد از تہذیب الاخلاق)

گذرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے - گھٹا چھا رہی ہے - بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے - آندھی بڑے زور سے چلتی ہے - دل کانپتا ہے - اور دم گھبراتا ہے - بڈھا نہایت غمگین ہے - مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے - نہ اکیلے پن پر - اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر - اور نہ برس کی آخیر رات پر - وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے - اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے - اتنا ہی غم بڑھتا ہے - ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بہے چلے جاتے ہیں -

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے۔ جبکہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا۔ اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا۔ "ہائے وقت! ہائے وقت! ہائے گذرے ہوئے زمانے! افسوس! کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا!"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سُرخ سفید چہرہ۔ سُڈول ڈیل۔ بھرا بھرا بدن۔ رسیلی آنکھیں۔ موتی کی لڑی سے دانت۔ اُمنگ میں بھرا ہوا دل۔ جذبات انسانی کی جوشوں کی خوشی۔ اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے۔ اور نیکی اور خدا پرستی کی بات سناتے تھے۔ اور یہ کہتا تھا کہ "آہ ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا۔ اور موت کے لئے طیار رہتا! آہ وقت گذر گیا! آہ وقت گذر گیا!۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے؟ افسوس! میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہکر برباد کیا۔ کہ "ابھی وقت بہت ہے"

یہ کہکر وہ اپنی جگہہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی۔ دیکھا۔ کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں

کے پتے اڑتے ہیں۔ اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا "ہائے! ہائے! میری گذری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے۔ جیسی یہ رات" یہ کہکر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔"

اتنے میں اُس کو اپنے۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن۔ دوست۔ آشنا یاد آئے۔ جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبّت سے اُس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ "ہائے بیٹا! وقت گذر گیا" باپ کا نورانی چہرہ اُس کے سامنے ہے۔ اور اُس میں یہ آواز آتی ہے۔ کہ "کیوں بیٹا! ہم تمھارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے"؟ بھائی بہن دانتوں میں اُنگلی دبائے ہوئے خاموش ہیں۔ اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ "اب ہم کیا کر سکتے ہیں"؟

ایسی حالت میں اُس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں۔ جو اُس نے نہایت بے پروائی اور بے مروّتی اور کج خلقی سے اپنے ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن۔ دوست۔ آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروّت رہنا۔ دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا۔ یاد آتا تھا۔ اور اُس پر اُن گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبّت کا دیکھنا اُس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اُس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا۔ اور یہ کہکر چلا اُٹھتا تھا۔ کہ "ہائے وقت نکل گیا! ہائے وقت نکل گیا! اب کیونکر اِس کا بدلہ ہو"؟

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اور ٹکراتا۔ لڑکھڑاتا کھڑکی کی طرف پہونچا۔ اُس کو کھولا۔ اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے۔ اور بجلی کی کڑک

کچھ کمی ہے۔ پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اُس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی۔ اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اُس کو اپنا ادھیڑپن یاد آیا۔ جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن۔ نہ وہ دل رہا تھا۔ نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اُس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا۔ جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی۔ حج کرنا زکواۃ دینی۔ بھوکوں کو کھلانا مسجدیں اور کنوئیں بنوانا۔ یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی۔ اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی۔ اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا۔ کہ اُس کے ذاتی اعمال کا اُسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں۔ یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی اسکی آواز نہیں سنتا۔ اور نہ مدد کرتا ہے۔ اُس کا دل بہت گھبراتا ہے۔ اور سوچتا ہے۔ کہ میں نے کیا کیا؟ جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی؟ اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کہکر چلاّ اٹھا "ہائے وقت! ہائے وقت! میں نے تجھکو کیوں کھو دیا؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اُس کے پٹ کھولے۔ تو دیکھا۔ کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ اُن کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک اُس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی۔ اور اُس میں ایک خوبصورت دلہن

نظر آئی۔ اُس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اُسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اُس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہوگیا۔ اور نہایت پاک دل اور محبّت کے لہجہ سے اُس سے پوچھا۔ کہ "تم کون ہو؟" وہ بولی کہ "میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں" اُس نے پوچھا۔ کہ "تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے؟" وہ بولی "ہاں ہے" "نہایت آسان پر بہت مشکل جو کوئی خدا کا فرض ادا کرکے۔ انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری میں سعی کرے۔ اُس کی میں مسخّر ہوتی ہوں" "دُنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے۔ جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے۔ وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز روزہ۔ حج۔ زکواۃ۔ اُسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اسکی موت ان چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادّی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھکو تسخیر کرنا چاہے۔ انسان کی بھلائی میں کوشش کرے" یہ کہکر وہ دُلھن غائب ہوگئی اور بڈّھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اُس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا۔ اور دیکھا۔ کہ اُس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اُس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے۔ ثواب کے لالچ۔ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ خاص انسانی بھلائی کی خالص نیّت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اُس دلفریب دُلھن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا

اخیر زمانہ دیکھکر آیندہ کینے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بیقرار ہوکر چلا اٹھا۔ ہائے وقت! ہائے وقت! کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں؟ ہائے! میں دس ہزار دینار دیتا۔ اگر وقت پھر آتا۔ اور میں جوان ہوسکتا!" یہ کہکر اُس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہوگیا۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ کہ اُس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اُس کی پیاری ماں اُس کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ اُس کو گلے لگاکر اُس کی بلائیں لیں۔ اِس کا باپ اُس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اُس کے گرد آکر کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا۔ کہ "بیٹا کیوں برس برس کے دن روتا ہے؟ کیوں تو بیقرار ہے؟ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟۔ اُٹھ منھ ہاتھ دھو۔ کپڑے پہن۔ نو روز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں" تب وہ لڑکا جاگا۔ اور سمجھا۔ کہ میں نے خواب دیکھا۔ اور خواب میں بڈھا ہوگیا تھا۔ اُس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اُس نے سنکر اُس کو جواب دیا۔ کہ "بیٹا! پس تو ایسا مت کر۔ جیسا اُس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کر۔ جیسا تیری دُلہن نے تجھ سے کہا"۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا۔ اور نہایت خوشی سے پکارا۔ کہ "اوہ! یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اُس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤں گا۔ اور ضرور اُس دُلہن کو بیاہوں گا۔ جس نے اپنا خوبصورت چہرہ مجکو دکھلایا۔ اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا! او خدا! تو میری مدد کر"۔

پس۔ اے میرے پیارے نوجوان ہموطنو! اور اے میرے بچو! انشائی

بھلائی پر کوشش کرو۔ تاکہ اخیر وقت میں اُس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے۔ کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور انسانی ہمدردی اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔

خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر

ان کے مورث اعلی سلطان زین العابدین شاہ کشمیر کے رہنے والے تھے اور حکومت سلاطین مغلیہ میں ان کے بعض بزرگ عہدہ ہائے قضائے کشمیر پر مامور ہوئے۔ ان کے والد خواجہ منظور اللہ ترک وطن کرکے تبت چلے گئے۔ وہاں سے ریاست نیپال میں آئے اور وہیں اقامت اختیار کرلی۔ چنانچہ یہ بھی سنہ ۱۲۴۲ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ ان کی چار برس کی عمر تھی۔ کہ والد اور نانا کو گردش زمانہ نے پھر ترک وطن پر مجبور کیا۔ اور اس مرتبہ بنارس میں طرح اقامت ڈالی۔ یہیں سن شعور کو پہونچے۔ اور تعلیم کا سلسلہ تکمیل کو پہونچا۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا اور اپنے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں میر منشی لفٹنٹ گورنر شمال و مغرب کے نائب مقرر ہوئے۔ انھیں ایام میں جب لارڈ الن برا نے گوالیار پر چڑھائی کی۔ تو یہ گورنر جنرل کے منشی خانے میں شامل ہوکر شریک مہم ہوئے۔ اور جنگ کے خاتمہ پر بہ صلہ کارگزاری خلعت پایا۔ پھر کئی سال بعد اپنے خالو کے بجائے میر منشی مقرر ہوئے۔ اور سنہ ۱۸۸۵ء تک برابر اس عہدۂ جلیلہ پر قائم رہے اور حکام میں اعلیٰ درجہ کا اعتبار اور وقار حاصل کیا۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں خیرخواہی کے صلہ میں سند و خلعت ہفت پارچہ مرحمت ہوا۔ ملکہ معظمہ کے خطاب شاہی اختیار کرنے کے موقع پر آپ کو تمغۂ قیصری

۱۱۔ ۱۸۸۵ء میں ۴۵ سال ملازمت کے بعد آپ نے پنشن لی۔ اور خان بہادر ذوالقدر کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

شاعری اور انشاپردازی میں آپ کو ایک امتیازی درجہ حاصل تھا غالب مرحوم سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ خطوط کا طرز تحریر نہایت دلکش تھا۔ آپ کی دو تصنیفیں۔ خونابۂ جگر۔ فغانِ بیخبر۔ یادگار ہیں۔ آپ نے پیرانہ سالی میں ۱۹۰۵ء میں انتقال فرمایا۔

صبح اور دوپہر اور شام ہونے کا سماں

صبح

رات آخر ہوئی۔ صبح صادق کا جلوہ نظر آنے لگا۔ ستارے جو رات کی تاریکی میں چمک دمک دکھا رہے تھے۔ اپنی روشنی کو پھیکی دیکھکر شرمائے اور آہستہ آہستہ غائب ہوئے۔ جیسے چور نور کا تڑکا ہوتے ہی اپنے ٹھکانے کو بھاگتے ہیں۔ شب کی سیاہی کا رنگ اڑا۔ مشرقی افق پر سفیدی نمودار ہوئی۔ گویا محبوب صبح نے رات کے سیاہ بکھرے ہوئے بالوں کو چہرے سے سمیٹ لیا۔ اور اس کی نورانی پیشانی نظر آنے لگی۔ نسیم سحری معشوقوں کی طرح خوش خرامی کرتی ہوئی چلی۔ نرم نرم شاخیں درختوں کی مستوں کے مانند جھومنے لگیں۔ جانوروں نے چہچہانا شروع کیا۔ باغ میں غنچے کھلنے لگے۔ جیسے نیند سے کوئی آنکھ کھولے۔ دریا میں پتلی پتلی لہریں پڑیں۔ کاتبِ قدرت نے قلم شعاع سے زرنگار کرنے کے لئے صفحۂ آب پر مسطر کیا۔ شاہی نوبتخانے کے کوس و دہل کی آواز بلند ہوئی۔ اس کی سریلی آواز سے لوگ نیند سے چونکے۔ اور اپنے اپنے کام سے لگے۔ میکدہ کا دروازہ

کھلا۔ مغبچوں نے صحنِ میخانہ کی رُفت و رُوب کی۔ پیرِ مُغ نے صُراحی اور ساغر سنبھالا۔ میکشوں نے شب کے خمار کی سرگرانی دفع کرنے کی غرض سے صبوحی کی فکر میں اُس طرف کی راہ لی۔ اِدھر مُرغ نے اذان دی اُدھر مؤذن بھی اپنے ورے سے نکل صحنِ مسجد میں آکھڑا ہوا اُس کے گلے سے گلا مِلانے لگا۔

یہ سُن کر رات بھر کے جاگے ہوئے عابد انگڑائیاں لیکر سجّادہ پر سے اُٹھے تہجّد اور عمامہ سنبھال عصا ہاتھ میں لے مسجد کی راہ ناپتے چلے۔ بتکدہ میں گھنٹے اور ناقوس بجے۔ برہمنوں نے پھول اور سیندور بتوں پر چڑھاکر بھیروی بھجن گانا شروع کیا۔ صنم پرستوں نے سجدہ بت کے لئے آمادہ ہوکر بیت الصنم کا ارادہ کیا۔

دوپہر

دوپہر کا وقت ہوا۔ آفتاب سمت الراس پر آیا۔ زمین تپنے لگی۔ پاؤں رکھتے ہوئے خوف آتا تھا۔ کہ چھالے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ کہ سانس کی گرمی سے لب پر پھپھولے نہ پڑیں۔ آسمان سے وہ آتشباری ہونے لگی۔ کہ ہوا نے شعلۂ جوّالہ کی صورت پیدا کی۔ خاک کے ذرّوں نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی۔ جانوروں نے ڈر سے اُڑنا موقوف کیا کہ جسم جل کر کباب نہ ہو۔ زمین کی وحشت سے سکتہ کی حالت ہوگئی۔ کہ دھوپ کی گرمی سے پگھل کر آب نہ ہو۔ دوکانداروں نے دوکانوں کے تختے لگا دئے۔ اور اُس کی آڑ میں پڑ رہے۔ لوگوں کا گھروں سے نکلنا۔ چلنا۔ پھرنا۔ بند ہوا۔ بازاریں سنسنان ہوگئیں۔ دن نے رات کا سنّاٹا پیدا کیا۔ شہر شہرِ خموشاں کا نقشہ بن گیا۔ چوپائے سایہ میں کھڑے

ہو کر ہانپنے لگے۔ ہر درخت بشکل چنار ہو گیا۔ دھوپ کی تابش سے معلوم ہوتا تھا۔
کہ کھڑا جل رہا ہے۔ گھاس مرجھا کر زمین سے ایسی لپٹ گئی۔ جیسے کسی نے
کاٹ کے ڈال دی ہو۔ حوضوں کا پانی ایسا گرم ہو گیا۔ کہ مسجدوں پر
حماموں کا گمان ہونے لگا۔ مؤذنوں نے چپکی سادھی۔ عابد بھی عبادت
چھوڑ کر قیلولہ کی سنت ادا کرنے کے بہانے سے لیٹ رہے۔ برہمن بتخانے
کے سرچینے میں یوں خاموش ہو کر بیٹھا۔ کہ بت بن گیا۔ میکدہ میں شیخ زانو
پر سر رکھ کے اس شکل سے ہو بیٹھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ مٹکے پر پیالہ اوندھا
دیا۔ غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی ٹٹیاں لگا لیں۔ مٹی کی صراحیوں
پر کپڑا بھگو کے لپیٹ دیا۔ امیروں نے تہ خانوں میں آرام فرمایا۔
خس کی ٹٹیاں چھڑکی جانے لگیں۔ فراشی پنکھے کھنچنے لگے۔ خس کی خوشبو
سے ہوا کے جھونکوں پر تخلخہ کا یقین آنے لگا۔ صراحیاں برف میں لگائی
گئیں۔ شربت کی قلفیاں جمائی گئیں۔

شام

دن شام ہوا۔ جھٹ پٹے وقت نے رات کی آمد کی خبر دی۔ مغربی گوشہ
سے تاریکی کا جوش ہوا۔ جیسے پہاڑ کے غار سے سیاہ ابر امنڈے۔ آفتاب
دن کے تماشا ختم ہونے سے ایسا اداس ہوا۔ کہ منہ پر زردی چھا گئی۔
با دل ناخواستہ مغرب کو چلا۔ لیلائے لیل نے شرم سے۔ کہ آفتاب جاتے
ہوئے اسے دیکھ نہ لے۔ سیاہ نقاب منہ پر ڈالا۔ ہوا جو دن بھر زور سے
چل رہی تھی۔ دھیمی ہوئی۔ اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ چلنے
لگی۔ درختوں کے پتوں نے کھڑکھڑانا۔ دریا کے پانی نے لہرانا موقوف کیا
پالے ہوئے جانور جو دن کو چرائی کے صحرا میں کلیل کر رہے تھے۔ ان کو

سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی۔ جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بڑھکر قدم مارنے لگتا تھا۔ عجب بات تھی۔ کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت۔ یا اُس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجّب ہوا۔ اور وہ تعجّب فوراً جاتا بھی رہا۔ یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی۔ تو دیکھتا ہوں۔ کہ کچھ خوبصورت خوبصورت عورتیں ہیں۔ اور بہت سے لوگ اُن کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا۔ کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں۔ نہ پریزاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت۔ کوئی عیّاشی ہے کوئی خود پسندی۔ کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمّت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے۔ تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انہی میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اُن پر درختوں کے جھنڈ سایہ کئے تھے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ گوناگوں میوے جھوم رہے تھے۔ طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دلفریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ اور آپس میں چھیڑ چھاڑ رہی تھیں۔ مگر ایسے ایسے اُلجھاوے بلندی کوہ کے اُدھر ہی اُدھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں۔ وہ اگرچہ اقوام مختلفہ۔ عہدہائے متفرقہ۔ عمرہائے متفاوت رکھتے ہیں۔ مگر وہی ہیں جو حوصلے کے چھوٹے۔ ہمّت کے ہیٹے۔ اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا۔ کہ جو بلند حوصلہ۔ صاحب ہمت۔ عالی طبیعت تھے وہ اُن سے الگ ہوگئے۔ اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندی کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔ اُسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتی تھی مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اِس ارادے سے آگے بڑھے۔ کہ بلندی کوہ پر چڑھ جائیں۔ اور جس طرح ہوسکے۔ پاس جاکر اس نغمۂ آسمانی سے قوتِ روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے اپنے ساتھ لینے لگے معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی۔ ایک ہاتھ میں نشان تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزا تھے۔ کسی کی بغل میں ایک کمپاس تھی۔ کوئی پنسلیں لئے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور دُوربین سنبھالے تھا بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرض علم ریاضی اور جرِّ ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا۔ جو اِس وقت کام میں نہ آرہا ہو۔ اِسی عالم میں دیکھتا ہوں۔ کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے۔ اور مجھے بھی اِس بلندی کا شائق دیکھکر کہتا ہے۔ کہ یہ سرگرمی اور گرمجوشی تمھاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منھ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اِس کے گروہ مذکور فرقے فرقے میں منقسم ہوگیا۔ کوہ مذکور پر راستوں کا شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑلی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا۔ کہ چھوٹی چھوٹی کھائیوں میں ہولئے۔ وہ تھوڑی ہی دُور چڑھے تھے۔ کہ اُن کا رستہ ختم ہوا۔ اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا۔ کہ ان پست

ہمتوں نے صنعتگری اور دستکاری کی راہ لی تھی - کہ روپے کے بھوکے تھے - اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے - میں اِن لوگوں کے پیچھے تھا - جنھوں نے دلاوروں اور جانبازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا - اور خیال کیا تھا - کہ چڑھائی کے رستے ہمنے پائے - مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم ہوئے - کہ تھوڑا ہی آگے بڑھکر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہوگئے - ہرچند برابر قدم مارے جاتے تھے - مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھتے تھے - میرے فرشتۂ رحمت نے ہدایت کی - کہ "یہ وہی لوگ ہیں" جہاں عقل صادق اور عزم کامل کام دیتا ہے - وہاں چاہتے ہیں کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں - بعضے ایسے بھی تھے - کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے - مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا - کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے - اُتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے - بلکہ بعضے ایسے ہوگئے - کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے - اُس سے وہ لوگ مراد ہیں - جو مدد روزگار سے ترقیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں - مگر کوئی ایسی حرکت ناشایستہ کرتے ہیں - کہ دفعۃً گر پڑتے ہیں - اور آیندہ کے لئے بالکل اُس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے -

ہم اتنے عرصہ میں بہت اونچے چڑھ گئے - اور معلوم ہوا - کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں - اوپر آکر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمت دو گروہوں میں منقسم ہوگئے - اِن دونوں شاہراہوں میں ذرا آگے بڑھکر ایک بھوت ڈراؤنی صورت - پلید ناک صورت کھڑا تھا - آگے جانے سے روکتا تھا - اِن میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک درخت خار دار کا ٹہنا تھا - بھوت کا نام دیو ہلاک تھا - اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بہانے تھے - جو اُولو العزموں کو راہ ترقی

پیش پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا۔ پٹنے کی مار منہ پر کھاتا تھا
دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی۔ گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ اِن کانٹوں
کی مار سے غول کے غول اہلِ ہمّت بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے۔ اور ڈر ڈر کر
چلاتے تھے۔ کہ ہئے ہئے موت! ہئے ہئے موت!"

دوسرے رستے پر جو بھوت تھا۔ اُس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت
کی طرح کچھ اِس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صلوت
اور نکروہ و معیوب کلمے۔ جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے۔ اِس لئے اُس کا
منہ ایسا بُرا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اُس کے
سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا۔ کہ برابر چھینٹیں اُڑاتے جاتا تھا۔ اور
ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا۔ تو اکثر
اشخاص ہم میں سے بیدل ہو کر رہ گئے۔ اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر
نادم ہوئے میرا یہ حال تھا۔ کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا
جاتا تھا۔ اور قدم آگے نہ اُٹھتا تھا۔ اِتنے میں ایک شہنائی کی آواز اِس
تیزی کے ساتھ کان میں آئی۔ کہ بجھے ہوئے ارادے پھر چمک اُٹھے جس قدر
کہ دل زندہ ہوئے اُسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اُڑتے گئے چنانچہ
بہت سے جاں باز جو شمشیریں علم کئے تھے۔ اِس کڑک دمک سے قدم مارتے
آگے بڑھے۔ گویا حریف سے میدان جنگ مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ جہاں
دیو کھڑا تھا۔ یہ اُس دھانے سے نکل گئے اور وہ موت کے دانت نکالے
دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے۔ وہ اُس
رستے پر پڑے۔ جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا۔ مگر اِس آواز کے ذوق و
شوق نے اِنھیں بھی ایسا مست کیا۔ کہ گالیاں کھاتے کیچڑ میں نہاتے پہنچ کر

یہ بھی اُس کی حد سے نکل گئے۔ چنانچہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں
تھیں۔ وہ بھی ان بھولوں ہی تک تھیں۔ آگے دیکھا تو اُن کی دسترس
سے باہر ہیں۔ اور راستہ بھی صاف اور ہموار۔ بلکہ ایسا خوشنما ہے۔ کہ مسافر
جلد جلد آگے بڑھے۔ اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہونچے۔
اِس میدان رُوح افزا میں پہونچتے ہی ایسی جاں بخش اور رُوحانی ہوا
چلنے لگی۔ جس سے رُوح اور زندگانی کو قوت دوامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام
میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا۔ اُس کا رنگ کبھی نورِ سحر
تھا۔ اور کبھی شام و شفق۔ جس سے قوس۔ قزح کے رنگ میں کبھی شہرت
عام۔ اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور سرور کا عالم دل
کو اس طرح تسلّی و تشفّی دیتا تھا۔ کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے
دھوئے جاتے تھے۔ اور اِس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام
پھیلتا تھا۔ جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر
عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوانِ عالیشان دکھائی دیا۔ کہ اُس کے چاروں طرف
پھاٹک تھے۔ اُس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک
پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے۔ اور وہی شہنائی بجا رہی
ہے۔ جس کے میٹھے میٹھے سُروں نے اُن مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک
کھینچا تھا۔ پری اُن کی طرف دیکھکر مسکراتی تھی۔ اور سُروں سے ایسی صدا
آتی تھی۔ گویا آنے والوں کو آفریں و شاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ
خیر مقدم! خوش آمدید!۔ صفا آورد ویدا!۔ اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی
فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ مؤرّخوں کا گروہ ایک دروازے پر استادہ
ہوا۔ تاکہ صاحب مراتب اشخاص کو حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے

یکایک وہ شہنائی۔ جس سے کبھی شوق انگیز و جوش خیز۔ اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے۔ اَب اس سے ظفریابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا۔ اور دروازے خود بخود کھل گئے۔

جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی راجاؤں کا راجہ مہاراجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرے کے گرد ہالہ کئے ہے۔ سر پہ سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اِس کے استقلال کو دیکھکر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اِس کی حق داری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جاں نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سائے میں لئے آتے ہیں۔ فرقے فرقے کے علماء اور مورّخ اُسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کہن سالہ رنگت کا کالا ایک پوتھی بغل میں لئے۔ ہندوؤں کے غول سے نکلا۔ اور بہ آوازِ بلند چلّایا۔ کہ "آنکھوں والو! کچھ خبر ہے۔؟ دیکھو! دیکھو! ترتیب کے سلسلے کو برہم نہ کرو۔ اور مرزنگار کے نور کو اجسامِ خاک میں نہ ملاؤ!" یہ کہہ کر آگے بڑھا تو اپنی پوتھی نذر گزرانی۔ اُس نے نذر قبول کی۔ اور نہایت خوشی سے اُس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو معلوم ہوا کہ اِس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا۔ کوئی کچھ سمجھا۔ اُس وقت ایک بِمان یعنی تخت ہوا دار آیا۔ وہ اُس پہ سوار ہوکر آسماں کو اُڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ رام چندر جی ہیں۔ اور یہ والمیک ہے۔ جس نے رامائن نذر دی۔ سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اِتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تختِ طلسمات کو تبیلی پہلی

اُڑائے لئے آتی ہیں۔ اُس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے۔ مگر نہایت دیرینہ سال۔ اُسے فرقے فرقے علما اور مورّخ لینے کو نکلے۔ مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بیقراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا۔ راجہ تو مہاراجہ بکرماجیت تھے۔ اور تخت سنگھاسن بتیسی پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہوگئیں۔ کہ جب تک سورج کا سونا۔ اور چاند کی چاندی چمکتی ہے۔ نہ آپ کا ستہ بیٹھے گا۔ نہ سکہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی۔ اور انھیں لے جاکر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل و قال ہوئی۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا۔ کہ اپنے دلو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے۔ اور اراکین دربار کہتے تھے۔ کہ یہاں تکشت اور غرور کا گذارا نہیں۔ اتنے میں وہی بتیس۳۲ پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اُسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا۔ ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اُٹھاکر آشیرباد کہی۔ اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنّے کے نو۹ دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ راجہ بھوج تھے اور بتیس۳۲ پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی۔ جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا۔ وہ کالی داس شاعر تھا۔ جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھکر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے۔ اتنے میں معلوم ہوا۔ کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش جھاڑ و فانوس سے بقعۂ نور بنا ہوا

ہے۔ ایک جوان ہیل پیکر۔ ہاتھ میں گُرزِ گاؤ سر۔ نشائے شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے۔ ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شاہانِ کیانی اور پہلوانانِ ایرانی موجود ہیں۔ کہ درفشِ کاویانی کے سایۂ بے زوال میں لئے آتے ہیں۔ حُبِّ قوم اور حُبِّ وطن اُس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے۔ اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا۔ اور سر پر کلّۂ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مورّخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ سب نے اُسے بہ تعظیم دیکھا۔ انہی میں سے ایک پیر مرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اُٹھائے کھڑے تھے۔ پیر مرد نے اہلِ مجلس کی طرف متوجّہ ہو کر چند اشعار نہایت زور کے پڑھے۔ نہیں۔ بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی۔ جو قیامت تک رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اُٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور گُلِ فردوس کا ایک طُرّہ اُس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی۔ کہ الٰہی! یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے"۔ تمام اہلِ محفل نے آمین کہی۔

معلوم ہوا۔ کہ وہ بہادر ایران کا حامی۔ شیرِ سیستانی۔ رستم پہلوان ہے۔ اور کہن سال مایوس فردوسی ہے۔ جو شاہنامہ لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اُس کے ایک نوجوان آگے بڑھا۔ جس کا حُسن شباب نوخیز۔ اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاج شاہی تھا۔ مگر اُس سے

ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ ساتھ اِس کے حکمتِ یونانی سرپہ چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا مگر سب اُسے دیکھکر ایسے محو ہوگئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مورّخ اور محقق اِس کے لینے کو بڑھے۔ مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اِس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لئے تیّار ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا۔ ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مورّخ تھا۔ اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جاکر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا۔ کہ "تم اِس گوشے کی طرف آجاؤ۔ کہ تمھاری نظر سب پر پڑے اور تمھیں کوئی نہ دیکھے"۔ یہ سکندر یونانی ہے۔ جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دئے ہیں۔

اِس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا۔ کہ سر پہ کلاہِ کیانی اور اُس پر درفش کاویانی جھومتا تھا۔ مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اِس طرح آتا تھا۔ کہ گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا۔ اور شرم سے سر جھکائے تھا جب وہ آیا۔ تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اُٹھا۔ اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اِس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا۔ اُس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی۔ وہ دارا بادشاہ ایران تھا۔

دفعتہً سکندر نے آواز دی "انھیں لاؤ"۔ جو شخص داخل ہوا۔ وہ ایک پیرمردِ بزرگ صورت تھا کہ مقیشی داڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اُس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا۔ سکندر خود اُٹھا۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر لایا۔ اپنے برابر کرسی پہ

بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ نظامی گنجوی ہیں۔ اور اس سہرے میں خمسے کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا "اب یہ کبھی نہ کمھلائیں گے"۔

بعد اس کے جو شخص آیا۔ اگرچہ وہ سادہ وضع تھا۔ مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحتِ روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آ چکے تھے ان سب سے زیادہ عالی رتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا۔ اور بائیں پر جالینوس۔ اس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے۔ کہ ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا۔ مگر اس مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے۔ کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی دوست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہینِ معقول کے ساتھ سب اہلِ محفل کو قائل کر لیا۔ کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے۔ اور یہ کہہ کر اوّل سکندر کو آئینہ دکھایا۔ پھر نظامی کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہِ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جبّہ و عمامہ اور طیلساں و دامن رکھتے تھے۔ مگر باہر روکے گئے۔ کیونکہ ہر چند ان کے جبّے دامنِ قیامت سے دامن باندھے تھے۔ اور عمامے گنبدِ فلک کا نمونہ تھے۔ مگر اکثر ان میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لئے منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک انبوہِ کثیر علما و فضلا کا ہو لیا۔ تعجب یہ ہے۔ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اتارے ان کے ساتھ تھے۔

بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لئے آشیرباد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ اُن میں ہارون رشید اور دوسرا مامون رشید تھا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی استخواں و ولایتی لباس تھا۔ اور جامہ خون سے قلمکار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اُس کے پاس تھے۔ مگر چونکہ ناواقف تھا۔ اس لئے کچھ زیور ہاتھ میں لئے تھا۔ کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہرچند یہ جواہرات اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے۔ مگر جہاں قدم رکھتا تھا۔ بجائے غبار کے آہوں کے دُھوئیں اُٹھتے تھے۔ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنّف اُس کے استقبال کو بڑھے۔ مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان خوش شمائل آیا۔ اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے اشتیاق اور شکر گزاری سے اُس کا ہاتھ پکڑا اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب نازو انداز سے مسکرایا اور چلا گیا۔ وہ ایاز تھا۔

اسی عرصے میں ایک اور شخص آیا۔ کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا۔ مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہوگئے۔ مگر تمام علما اور فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا۔ اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی۔ اس پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی۔ تورانی۔ لوگوں کا دیکھا۔ کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے۔ مگر انداز ہر ایک کے جُدا جُدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا۔ اور بعض کی بغل میں کتاب تھی۔ کہ اوراق اُن کے

نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے۔ کہ ہم معانی و مضامین کے مصوّر ہیں۔ اُن کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ "تم مصوّر بے شک اچھے ہو۔ مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیا کے مصوّر ہو۔ تمھاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں البتہ انتخاب ہوسکتا ہے۔" یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ انوری۔ خاقانی۔ ظہیر فاریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہوکر اندر آئے باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر تھے کان پر قلم دھرا تھا۔ اُس میں سے آبحیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مگر کبھی کبھی اُس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اس لئے اِس پر پھر تکرار ہوئی۔ اُس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفع اعدا کے لئے تلوار دی ہے۔ مگر مُلکِ مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہرآب کی بھی نہ رکھیں۔ تو اعدائے بدنہاد ہمارے خونِ عزّت کے بہانے سے کب باز رہیں چنانچہ یہ عذر اُس کا قبول ہوا۔ یہ انوری تھا جو باوجودِ گل افشانیٔ تحفۂ حسنات کے بعض موقع پر اس قدر ہجو کرتا تھا۔ کہ کان اُس کے سُننے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔

خاقانی پر اِس معاملے میں اُس کے اُستاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چونکہ اُس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی۔ اِس لئے وہ بھی اِن کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہوسکا۔

اسی عرصے میں چنگیز خاں آیا۔ اُس کے لئے گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا۔ بلکہ جب اندر لائے۔ تو خاندانی بادشاہوں نے اُسے چشمِ حقارت سے دیکھکر تبسّم کیا۔ البتہ مؤرخوں کے گروہ نے بڑی دھوم

دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامہ کا لفظ نکلا۔ تو اُس نے فوراً
شمشیرِ جوہر دار سند کے طور پر پیش کی۔ جس پر خونی حرفوں سے رقم تھا۔
"سلطنت میں میراث نہیں چلتی"۔ علما نے غل مچایا۔ کہ "جس کے کپڑوں
سے لہو کی بو آئے وہ قصاب ہے"۔ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں"۔
شعرا نے کہا۔ کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوّرانِ تصانیف
کی تحریر نے رنگِ بقا نہ ڈالا ہو۔ اُسے اس دربار میں نہ آنے دیں گے"۔
اس بات پر اُس نے بھی تامل کیا۔ اور متأسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت
ہاتف نے آواز دی۔ کہ "اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو
قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا۔ تو آج
قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا"۔ اتنے میں چند مورّخ
آگے بڑھے۔ انھوں نے کچھ ورق دکھائے۔ کہ ان میں طورۂ چنگیز خانی
یعنی اُس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا۔ کہ اُسے
دربار میں جگہ دو۔ مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دیدو۔ اور
ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور
آیا اس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اس کے لئے چند علما نے بھی مورّخوں
کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے۔ تو اس کے لئے بھی تکراروں کا غل ہوا
چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا جس کی
وضع متشرع عالموں کی تھی۔ لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب۔ دوسری
طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل میں فلسفہ اور حکمت کے
چند اجزا تھے۔ اُن کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انھیں دیکھ کر کوئی

بول نہ سکا۔ اُسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو شیخ بو علی سینا نے یہ کہکر پاس بٹھا لیا۔ کہ "آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے۔ شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی۔ مگر وہ سب کو دروازے پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا۔ کیونکہ وہ خود مورخ تھا۔ رستہ جانتا تھا۔ اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہا "اے اہلِ تصنیف میں تم سے سوال کرتا ہوں۔ کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمھیں قلم تحریر دیا ہے۔ اُسے اظہارِ واقعیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لئے کام میں لانا چاہیئے۔ یا اغراض نفسانی اور بد زبانی میں"؟ تمام مورخ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ کہ یہ کس پر اشارہ ہے۔ تیمور نے ابن عرب شاہ کے بُلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ کہیں پیچھے رہگیا چنانچہ اس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اُسی حال میں دیکھتے ہیں۔ کہ ایک بزرگ آزاد وضع۔ قطع تعلق کا لباس بر میں۔ خاکساری کا عمامہ سر پہ۔ آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا مورخ و شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازے پر آکر ٹھیرے۔ سب نے آگے بڑھنے کی التجا کی۔ تو کہا "معذور رکھو۔ میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے"؟ اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے۔ اگر تمام اہلِ دربار کا شوقِ طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشۂ بینائی ان کے ہاتھ میں تھا۔ کہ

اُس میں کسی کو دودھ۔ کسی کو شربت۔ کسی کو شرابِ شیرازی نظر آتی تھی ہر ایک کرسی نشین اُنھیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے وہ حافظِ شیراز تھے۔ اور شیشۂ مینائی اُن کا دیوان تھا۔ جو فلکِ مینائی کے دامن سے باندھے ہے۔ لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے۔ کہ دور سے دیکھا بیشمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں ان کے ایک مرد نورانی صورت۔ جس کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی۔ اور خندہ جبینی نے ایک طرّہ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ۔ دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے۔ جو باہر استقبال کو کھڑے تھے۔ مگر اُنھیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیونکہ ایسا کون تھا؟ جو شیخ سعدی اور اُن کی گلستاں بوستاں کو نہ جانتا تھا۔ ہے۔ اُنھوں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اِس بیچارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی۔ لیکن اور کرسی نشین۔ کہ اکثر اُن سے واقف تھے اور اکثر اشتیاقِ غائبانہ رکھتے تھے۔ وہ اُن کے مشتاق معلوم ہوے باوجود اِس کے یہ ہنسے اور اتنا کہکر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے "دنیا دیکھنے کے لئے ہے۔ برتنے کے لئے نہیں"

بعد اِس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اُولو العزم شخص آیا جس کے چہرے سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا۔ اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مار رہا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی۔ اور مقدمہ یہ تھا۔

کہ اگر علما کی نہیں۔ تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیئے۔ بلکہ چغتائی
خاندان کے مورخ صاف اِس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اِس نے باوجود
اِس کے ایک کرسی جس پر تیموری تمغا بھی لگا تھا۔ گھسیٹ لی۔ اور
بیٹھ گیا ہمایوں اُسے دیکھکر شرمایا۔ اور سر جھکا لیا۔ مگر تاجِ شاہی پر
انداز کج کلاہی کو بڑھاکر بیٹھا۔ اور کہا کہ "یے حق بے استقلال ہے"
اُس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ" مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن
کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلے گی اور فخر کرے گی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا۔ جس کو انبوہِ کثیر ایرانی
تورانی۔ ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں سے آتا تھا۔
وہ جس وقت آیا۔ تمام اہلِ دربار کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھیں اور
رضامندی عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے۔ کہ اکثر مسلمان اُس کو مسلمان
سمجھتے تھے۔ ہندو اُسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست
دکھائی دے رہا تھا۔ نصاریٰ اُس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ مگر اُس کے
تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہمقوموں اور ہم
مذہبوں کی شکایت کرکے بدایونی پر خون کا دعویٰ کیا۔ کہ اُس نے میری
حیاتِ جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا۔ اور وہ فتحیاب ہوتا۔ اگر چند منصف
مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی
نہ کرتی سب نے کہا "نیت کا پھل ہے"

اِس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا۔ جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم
ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحبِ جمال اس کا
ہاتھ پکڑے آتی تھی۔ اور جدھر چاہتی تھی۔ پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا

اُس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا۔ اور جو کچھ کہتا تھا۔ اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جز کاغذوں کا تھا۔ اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھکر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اِس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اِس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھ کھلتی تھی۔ تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہ جہاں۔ بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مورّخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لئے تھے۔ اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت اُن عمارتوں کے فوٹو گراف ہاتھ میں لئے تھے جو اِس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں۔ اور سیکڑوں برس کی راہ تک اُس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اِس کے آنے پر رضامندی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچّوں کو ساتھ لئے آیا۔ کہ اپنی آنکھوں کا اور بچّوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہریار شاہجہاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور بچّے اس کے بھتیجے تھے۔ اُس وقت وزیر اُس کا آگے بڑھا۔ اور کہا کہ جو کیا گیا بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا۔ بلکہ خلق خدا کی امنیت اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اُسے دربار میں جگہ ملی۔ اور سلاطینِ چغتائیہ کے معزز درجے پر ممتاز ہوا۔

ایک تاجدار آیا۔ کہ جبّے اور عمامے سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا مگر دوسرے ہاتھ میں جو فردِ حساب تھی اُس میں غرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی میزان کو پڑتا لتا ہے۔ سب نے دیکھکر کہا۔ کہ انھیں خانقاہ میں لیجانا چاہیئے۔ اِس دربار میں ان کا کچھ کام نہیں

لیکن ایک ولایتی۔ کہ مقطع اور معقول نظر آتا تھا۔ وہ دونو ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا۔ اور کہا کہ اے ارکینِ دربار! ہمارے ظلِّ سبحانی نے اِس کمبخت سلطنت کے لیے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اِس پر بھی تمھارے اعتراض اِس دربار میں جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اُس نے اِس مسخراپن سے ادا کیا۔ کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی۔ کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انھیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ عالمگیر بادشاہ اور ساتھ اُس کے نعمت خاں عالی تھا۔

اِس کے ساتھ ہی ایک بیڈھا جوان دکھنی وضع۔ جنگ کے ہتیار لگائے۔ راجگی کے سکّے ٹھٹے سے سجا ہوا آیا۔ اِس کی طرف لوگ متوجّہ ہوئے بلکہ عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا۔ مگر وہ کرسی کھینچ کر اُس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اور بولا کہ صاحب ہمّت کو جگہ دو یا نہ دو۔ وہ آپ ہی جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ سیواجی تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ اور بعد اِس کے ایک بادشاہ آیا۔ اُس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنّفوں اور موّرخوں میں سے کوئی اِس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے۔ کہ کوئی اِن میں گویا اور کوئی بھانڈ۔ کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے کیونکہ ایک ولایتی ولاور اُن کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ عَلم کیے تھا۔ اِس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخمل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا۔ اور اسپ بخارائی زیر راں تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمّد شاہ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی

سب نے کہا۔ کہ "نکالو اِن کا یہاں کچھ کام نہیں" چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا جس نے سرحدِ رُوم سے بخارا تک فتح کرکے تاجِ ہندوستان سر پہ رکھا تھا اُسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مِل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ اِن لوگوں میں کوئی مرقّع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ اِنھیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے۔ اور وجد کرکے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ اِن میں ایک شخص دیکھا۔ کہ جب بات کرتا تھا۔ اُس کے مُنھ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے۔ کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اُٹھا ہی لیتا تھا وہ میرزا رفیع سودا تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے۔ اور مُنھ پھیر لیتے تھے۔ دردؔ کی آواز دردناک دنیا کی بے ثباتی سے جی بیزار کئے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پہ نیا بھروپ دکھاتے تھے دم میں عالم ذی وقار۔ متّقی پرہیزگار۔ دم میں داڑھی چٹ۔ بھنگ کا سونٹا کندھے پر۔

جراءت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان لگاتا تھا۔ تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گلکاری

چشم آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور اکثر جگہ قلمکاری اِس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے۔ مگر جب کچھ کہتے تھے۔ جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس۔ جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے۔ جریبا ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور اِن کے دست و گریباں ہو جاتے۔ لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار اِن کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میر امن دہلوی۔ چار درویش کے مصنف تھے۔ اور بانکے صاحب میرزا سرور فسانۂ عجائب والے تھے۔ ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ اُنھوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اُٹھکر ملک الشعرائی کا تاج اِن کے سر پر رکھدیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے۔ پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے۔ اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا۔ کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کُرسی خالی ہے۔ اور بس اتنے میں آواز آئی۔ کہ آزاد کو بلاؤ"۔ ساتھ ہی آواز آئی۔ کہ "شاید اِس جرگے میں بیٹھنا قبول نہ کرے"۔ مگر وہیں سے پھر کوئی بولا۔ کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھا دوگے بیٹھ جائے گا"۔ اتنے میں چند اشخاص نے غُل مچایا۔ کہ "اُس کی قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ اُسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیئے"۔ اِس مقدمے پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ نقاب

چہرے سے اُلٹ کر آگے پڑھوں اور کچھ بولوں۔ کہ میرے ہادیِ ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چپکے سے کہا۔ کہ "ابھی مصلحت نہیں" اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا۔ اور خدا کا شکر کیا۔ کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی۔ مُردوں سے زندوں میں تو آیا

شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ دہلوی

پیدائش دہلی ۱۸۳۲ء　　　　وفات دہلی ۱۹۱۰ء

آپ یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۵۵ء میں آپ کی ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مدت تک صیغہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر سرفراز رہے۔ آخر میں میور سنٹرل کالج الٰہ آباد کے پروفیسر رہے۔ وہیں سے ۳۲ سال ملازمت کے بعد ۱۸۸۷ء میں آپ نے پنشن لی۔ ۲۴ سال پنشن لے کر ۷۸ برس کی عمر میں ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دہلی میں وفات پائی۔

اُردو زبان کی جس قدر خدمت آپ نے کی ہے۔ کسی کو کم اتنا موقع ملا ہوگا تہذیب الاخلاق انسٹیٹیوٹ گزٹ علیگڑھ اور مختلف پرچوں میں آپ کے مضامین برابر نکلتے رہے۔ آخر دم تک تصنیف اور تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ علوم ریاضیہ اور طبعیات میں آپ کو خاص مہارت تھی۔ اِن علوم کا ایک عمدہ ذخیرہ آپ نے اُردو زبان میں جمع کرکے ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ جو کمی شخصوں کی ہمت سے باہر تھا۔ حساب۔ جبر مقابلہ اقلیدس۔ مساحت میں آپ کی ۸۲ تصنیفات ہیں۔ جو چھپ کر شائع ہو چکیں۔ علم طبعیات میں ۱۳ جغرافیہ میں [illegible]۔ تاریخ میں ایک [illegible] تاریخ ہندوستان کی [illegible] جلدیں [illegible]

اور ایک صرف عہد انگلشیہ کی تاریخ ہے - ۵ جلدوں میں - ہندؤں کے عہد کی تاریخ ہے - ایک جلد میں - یورپ کی تہذیب اور آئین قیصری وغیرہ **علم اخلاق** - اور **ادب** میں ۲۲ کتابیں ہیں - اُردو زبان میں ایسا شخص کم ہوگا جس کی مختلف علوم میں ۱۳۴ تصنیفیں ہیں -

آپ کا طرز تحریر سادہ اور صاف ہے - اُس میں زبانِ دہلی کی خوبی اور ظرافت کا چٹخارا بھی موجود ہے -

سب چیزوں میں شان الٰہی نمایاں ہے

عالمِ باطنی ہی میں **خدا** جلوہ نما نہیں ہے - بلکہ وہ عالمِ ظاہری میں بھی خود نما ہے آسمان میں بحر و بر میں مخلوق کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے - جس میں اُس **حکیم** کارساز کی شان کی نشانیاں نہ موجود ہوں - اور اُس وارا سے **خلق** کی قدرت و صنعت کی بے شمار شہادتیں نمایاں نہ ہوں - خواہ اُس مخلوق کو جو اجزا کی ترکیب سے مرتب ہوئی ہے خواہ اور انتظام و ترتیب عالم کو دیکھو - سب میں اُسی کے ظہور کا جلوہ ہے - جیسے انسان کوئی چیز بناتا ہے تو اُس میں صانع کی فہم کا اندازہ ظاہر ہوتا ہے - ایسے ہی انتظام و مصالح عالم سے جہاں آفریں کی حکمت و دانائی معلوم ہوتی ہے - جیسے نوع بشر میں بھلے کام جو ہوتے ہیں - وہ فاعل کے حسن خلق کو ثابت کرتے ہیں - ایسے ہی دنیا میں انسان کے لئے خوش دلی کے سازو سامان مہیا ہیں - وہ منعم حقیقی کی ذات پر شہادت دیتے ہیں - جیسے کہ اِس عالم میں قدرت دانائی ارادہ کی نشانیاں اَن گنت ہیں - ایسی ہی اُس عالم آرا کی قدرت و حکمت و لطف و کرم بے انتہا ہیں - فلک اور فضائے آسمانی میں دیکھو - کہ صانع بدائع اُس

صانعِ حقیقی کے ہاتھ کے موجود ہیں۔ دن سے دن رات سے رات کہہ رہی ہے۔ کہ چاند سورج ستارے اُس فلک آفریں نے پیدا کئے ہیں۔ اور اُن کو اپنا محکوم بنایا ہے۔ اسرارِ عالم کے خزانوں کی کنجیاں اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں۔ اُس کے سوا کسی کو اُن کا حال معلوم نہیں۔ وہی جانتا ہے۔ کہ ان بحر و بر میں کیا کیا بھرا پڑا ہے۔ وہ ایسا علیم ہے۔ کہ اگر یہاں کوئی پتّا گرتا ہے۔ تو اُسے وہ جانتا ہے۔ وہ بجلی کو چمکاتا ہے۔ پانی بھرے بادلوں کو لاتا ہے۔ وہ اناجوں کو پیدا کرتا ہے۔ آسمان و زمین کی پیدائش ہیں۔ رات دن کے بدلنے ہیں۔ آسمان سے پانی کھینچے ہیں جس سے زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ زمین اور آسمان کے درمیان ہوا اور بادل جو خدمت کرتے ہیں اُن کے بدلنے ہیں۔ ایسے آیاتِ ربّانی ہیں۔ جن میں اگر غور کیجیے۔ تو اُس ذات پاک کی عظمت و شان کو ظاہر کر رہی ہیں۔

خدائے تعالیٰ ہی سب چیزوں کی جان ہے۔ وہی جنگلوں کو بنا سنوار کے تنہا نشین خود رو بناتا ہے۔ جس کو کوئی آنکھ نہیں دیکھتی۔ وہی لہلہاتے کھیتوں کو پوری پیکر بنا کر دلوں کو لبھاتا ہے۔ وہ سال کی تقسیم ایک ترتیب سے کرتا ہے۔ جاڑے کی ایک حد مقرّر کرتا ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں دھر سکتا۔ اُس کی تیزی کو کُند کرتا ہے۔ اس موسم میں عجیب حکمت سے بعض میووں کے نرم بیجوں کو اندر رکھتا ہے۔ کہ کوئی مضرت اُن کو باہر سے نہیں پہونچ سکتی۔ اِدھر ایک موسم کے پھول کھلا رکھے ہیں۔ اُدھر اُس نے دوسرے موسم کے پھول کھلائے۔ جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہی سارے عالم کا خداوند مالک ہے۔ وہی سب جگہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ سب جانداروں کی جان ہے۔ پھولوں میں دیکھو کہ

اُس مصوّرِ بے نظیر نے اپنی قلمکاری سے کیا کیا نقش و نگار بنائے ہیں۔ کیسی کیسی اُن کو خوشبوئیں عنایت کی ہیں۔ کیا کیا رنگ اُن میں پیدا کیئے ہیں۔ اُن کی آنکھوں کو اِمرت کے پانی سے دھویا ہے۔ اُس نے اِن دانوں میں۔ کہ جن کی تعداد سمندر کے ریگستان کے ذرّوں کی طرح بے شمار ہے۔ وہ صورتیں داخل کی ہیں۔ جو ساری زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔ کیا خوش دل وہ شخص ہے۔ جو خدا کے ساتھ رہتا ہے۔ مزوں میں۔ خوشبوؤں میں۔ میوؤں میں۔ پھولوں میں۔ اُسی کو وہ پاتا ہے۔ خلقت میں ایک بڑے درخت سے لیکر گھاس کے پتّے تک جو دھوپ میں پڑا پل رہا ہے۔ یادِ الٰہی میں دیکھتا ہے۔

شعر

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید   وحدہٗ لا شریک لہ گوید

گھر کی تربیت

گھر ہی میں آدمی اخلاق کی تعلیم پاتا ہے۔ بڑی خواہ کھلی۔ گھر ہی میں آدمی چال چلن کے وہ اصول سیکھتا ہے۔ جو اُس کے ساتھ ساری عمر رہتے ہیں۔ جوانی اور پیری میں وہ اُنھیں پر چلتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آدمی کی خصلت کی بڑی تعلیم گاہ گھر ہے۔ مشہور ہے۔ کہ اوضاع و اطوار آدمی میں آدمیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آدمی میں آدمیت اُس کا دماغ پیدا کرتا ہے۔ مگر اِن دونوں باتوں سے زیادہ سچ یہ بات ہے۔ کہ آدمی میں آدمیت گھر پیدا کرتا ہے۔ گھر میں آدمی کا دل کشادہ زیادہ تر ہوتا ہے۔ وہ ساری عادتیں پیدا کرتا ہے۔ وہیں اُس کی عقل پیدا ہوتی ہے۔ گھر ہی کی ٹکسال میں

خصلت کے کھوٹے کھرے سکّے ڈھالے جاتے ہیں۔ گھر ہی سے وہ اصول و مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جو معاشرتِ انسانی پر حکومت کرتے ہیں۔ گھر ہی کی باتوں کا عکس قانون ہوتا ہے ننّھے بچّوں کی وہی ننھی ننھی رائیں بڑے ہونے پر جمہوریت نام کا دستور العمل بنتی ہیں۔

آدمی جب دُنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ نہایت ہی بے کس اور بے بس ہوتا ہے۔ اُس کی کُل پرورش و تربیت و تعلیم اُن آدمیوں کے ذمّے ہے جو اُس کے آس پاس ہوتے ہیں۔ جس وقت سے وہ سانس لینے لگتا ہے۔ اُس کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔

ابتدا میں بچّے کی تعلیم اِس طرح ہوتی ہے۔ کہ وہ جو دیکھتا ہے اُس کی نقل اُتارتا ہے۔ عربی ضرب المثل ہے۔ کہ "انجیر کے درخت کو دیکھ کر انجیر کا درخت زیادہ پھل لاتا ہے" اور ہماری مثل ہے کہ "خربوزے کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" پس یہی بچّوں کا حال ہے۔ کہ وہ مثال کی تقلید سے تعلیم پاتے ہیں۔ بڑی معلّمہ مثال ہے۔ بچپنے کی خصلت آدمی کی خصلت کا مغز ہوتا ہے۔ باقی اور تعلیم بالائی پوست ہے۔ جس کے اندر وہ مغز ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک شاعر کا قول کیا ہی سچّا ہے! کہ جس طرح صبح دن کو دکھاتی ہے۔ ایسے ہی بچّہ آدمی کا حال بتلاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" جو باتیں ولادت کے وقت ہماری طبیعت میں نفوذ کرتی ہیں۔ وہی دیرپا اور ہمارے چال چلن کی محرک ہوتی ہے۔

بچّہ جب پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ ایک نئے عالم کی چوکھٹ پر قدم رکھتا ہے۔ ہر چیز کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ چیزوں کو غور کی نظر سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اشیاء کا باہم مقابلہ کرتا ہے۔ اُن کے

تصوّرات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے۔ ایک فاضل نے لکھا ہے۔ کہ اٹھارہ
اور بیس مہینے کی عمر کے درمیان اُس کو مادّی اشیاء اپنے قوائے خواص اجسام
اور اپنے اور دوسروں کی فہم کا اتنا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ باقی ساری
عمر میں اِس قدر نہیں ہوتا۔ اِس عمر میں علم کا خزانہ جو جمع ہوتا ہے۔
اور اُس کے دماغ میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ضروری
ہوتے ہیں۔ کہ اگر وہ کسی طرح ملیا میٹ ہو جائیں۔ تو پھر اُس کا ایک
ہفتہ جینا محال ہو جاتا ہے۔

یہ بچپن ہی کی کیفیت ہے۔ کہ "دل لوح سادہ برائے ہر نقش آمادہ"
جو چنگاری اوّل اُس میں پڑتی ہے۔ وہ اپنی روشنی دکھاتی ہے۔ خیالات
جلد ذہن میں آ جاتے ہیں۔ اور دیر تک قائم رہتے ہیں۔ بچپن میں جو باتیں
ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ اکثر اخیر عمر تک ساتھ رہتی ہیں۔ بچپن ہی میں خصلت کی
تعلیم کی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یعنی مزاج کی۔ ارادے کی۔ عادت کی۔ جن پر
آئندہ ساری عمر کی خوش دلی بہت کچھ منحصر ہے۔ اگر کسی عالی دماغ حکیم کو
روزانہ بے آرامیوں اور بد اخلاقیوں اور کمینہ پن کی حالت میں پھنسا دو۔
تو وہ خود بخود وحشی پن کی طرف کھنچا چلا جائے گا۔ پس جب عاقلوں کی یہ
نوبت ہے۔ تو بچے کا کیا حال ہو گا۔ جو بیکس ہے۔ اور موم کی طرح بہت
آسانی سے نقش قبول کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔

جس گھر میں محبّت کا اور ادائے حقوق شرافت کا شوق غالب ہے
جس میں دل و دماغ دونوں عاقلانہ حکم چلاتے ہیں۔ جس میں روزمرہ کے
کاروبار زندگی میں دیانت امانت راستی موجود ہے۔ جس میں عاقلانہ مشفقانہ
انتظام موجود ہے۔ اُس گھر میں یہ توقع ہو سکتی ہے۔ کہ اولاد تندرست و

خوشدل نفع رساں ایسی پیدا ہو۔ کہ جب اُس کو قوت اپنے مربیّوں کے قدم
بقدم چلنے کی حاصل ہو۔ تو وہ نیک دلی کے طریقوں پر چلے۔ اپنے نفس پر
ضابطہ ہو۔ اور اپنے ہمسائے کے آدمیوں کی بہبودی اور رفاہِ عام میں
معاون ہو۔ بچّے کی طبیعت کے ڈھالنے کے لیے سب سے عمدہ سانچہ نمونہ
ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ میرے بچّوں کی خصلتیں اچھّی ہوں۔ تو اُن کے
سامنے اپنی خصلت کے اچھّے نمونے پیش کرے۔

ہر بچّے کی آنکھوں کے سامنے جو نمونہ مستقل طور پر رہتا ہے۔ وہ اُس کی
ماں ہے۔ سَو معلّموں کے برابر ایک اچھّی ماں ہوتی ہے۔ گھر میں وہ سارے
دلوں اور ساری آنکھوں کی مقناطیس ہوتی ہے۔ اولاد ہمیشہ ماں کی پیرو
ہوتی ہے۔ مثال امر سے بہتر ہوتی ہے مثال تعلیم بالعمل کو کہتے ہیں۔ امر زبانی
حکم کو۔ مثال اپنی بے زبانی سے جو تعلیم کرتی ہے۔ وہ زبانی اوامر نہیں کرتے
مثال بڑھکے رو برو عمدہ اوامر بہت ہی کم فائدہ دیتے ہیں۔ مثال کی پیروی
کی جاتی ہے۔ اوامر کی نہیں۔ جب امر خلاف عمل کے ہوگا۔ تو وہ بزدلانہ
برائیاں سکھائے گا۔ بچّے ہی اپنے ماں باپ کی اس بات کو سمجھ جاتے ہیں
کہ وہ کہتے ہیں کچھ اور کرتے ہیں کچھ اور۔ اگر کوئی واعظ کسی کا مال مار کر
جیب میں رکھے۔ اور دیانت کا وعظ کہے۔ تو کچھ اثر نہ ہوگا۔ گھر عورت
کی دارالسلطنت ہوتا ہے۔ اس میں سارے احکام اُس کے چلتے ہیں۔ وہ
اپنے بچّوں کی ننھی ننھی رعیّت پر حکم ناطق نافذ کرتی ہے۔ ہر چیز کے لیے
بچّے اپنی آنکھوں کو اُس کی طرف لگائے رہتے ہیں۔ ہر وقت اُن کے روبرو
وہی مثال اور نمونہ ہے۔ جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ اور نقل اُتارتے ہیں
گو اُس کا علم خود اُن کو نہ ہوتا ہو۔ اس واسطے بچّوں کی چال چلن اور طور

طریقے پر ماں کا اثر بہ نسبت باپ کے زیادہ ہوتا ہے۔ گھر میں ماں کا نیک مثال ہونا ایک بڑی نعمت ہے۔

ابتدائے عمر میں دل کے اندر جو خیالات جم جاتے ہیں۔ اُن کا حال ایسا ہوتا ہے۔ جیسے کہ کسی چھوٹے پودے کی چھال پر حروف کندہ کر دئے جائیں۔ وہ درخت کے ساتھ بڑھتے چلے جائیں گے۔ گو وہ کیسے ہی ہلکے ہوں مگر مٹنے کے نہیں۔ زمین پر بیج ڈالے جاتے ہیں۔ تو کچھ مدّت تک وہ یونہی پڑے رہتے ہیں۔ پھر پھوٹتے ہیں۔ اور بڑھتے ہیں۔ کہ آخر کو وہی ہمارے عادات اور اعمال ہو جاتے ہیں۔

نسلِ انسانی کا ظاہری انتظام مہرِ مادری پر ہے۔ جس کا اثر مدام اور عالمگیر ہے۔ جب سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اور اُس کے ساتھ ہی ماں کی محبّت کا اثر شروع ہوتا ہے۔ بچّوں پر نیک ماؤں کا اثر عمر بھر رہتا ہے۔ جب اولاد دُنیا کے کام دھندوں جھگڑوں بکھیڑوں۔ اور تردّدات اور تفکّرات میں پڑتی ہے۔ اور تکلیفات اور مشکلات پیش آتی ہیں۔ تو وہ صلاح و مشورے اور تسلّی و تشفّی کے لئے ماؤں ہی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مصیبت کے وقت ماں ہی یاد آتی ہے۔ مائیں اپنے بچّوں کے دلوں میں جو عمدہ اور پاکیزہ خیالات جما دیتی ہیں۔ وہی بڑے ہوئے پر نیک اعمال کی صورت میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔

عورت سب معلّموں سے زیادہ نرمی اور ملائمت سے تعلیم کرتی ہے۔ مرد انسانیت کا دماغ ہے۔ عورت اُس کا دل ہے۔ وہ اُس کی قوّت ہے۔ یہ اُس کا حُسن و زیبا و زینت ہے۔ مرد عقلی ہدایتیں کرتا ہے۔ مگر عورت قلب کی درستی کرتی ہے۔ جس سے خصلت سنورتی ہے۔ مرد حافظے کو پُر

کرتا ہے۔ عورت دل کو پُر کرتی ہے۔ مرد جس بات کا یقین دلاتا ہے۔ عورت اُس کی محبّت دلاتی ہے۔ غرض عورت کی بدولت اکثر ہماری رسائی نیکی پر ہوتی ہے۔

اگر کوئی عورت نیک اطوار۔ کفایت شعار۔ خوش مزاج۔ پاکیزہ طبیعت کسی گھر کی سرپرست ہو۔ تو سارے کنبے کی زندگی بخیر و عافیت بسر ہوگی۔ اور وہاں آرام و چین۔ نیکی اور خوش دلی۔ طرح طرح سے اپنے جلوے دکھائینگی اور وہاں مرد کے لئے بہت سے ہراہی دل کے خوش کرنے والے موجود ہونگے دلوں کے لیئے عبادت گاہ وہاں تیّار ہے۔ حادثات زمانہ سے بچنے کے لئے امن وہ ہے۔ محنت و مشقت کے بعد آرام گاہ ہے۔ مصیبت و افلاس میں تسلّی و تشفّی وہاں ہے۔ غرض ہر درد کی دوا وہاں موجود ہے۔ اور ہر وقت خوشی اور راحت کا سامان مہیّا ہے۔

بچّوں اور بڑوں کی تربیت اخلاق میں گھر جیسا سب مدرسوں سے بہتر ہے۔ ویسا ہی بدتر بھی ہوسکتا ہے۔ گھر میں اُس قوّت کا ہونا بھی ممکن ہے۔ جو بچپن سے لے کر دم آخر میں تک بے حد شرارت اور جہالت پیدا کرتی ہے ماؤں اور دائیوں کی نالائقی سے کیا کیا اخلاقی آفات اور امراض ظہور میں آتے ہیں۔ بچّے کو ایک پاجی جاہل دایہ کے حوالہ کردو۔ تو بچّے میں وہ عیب پیدا ہوگا۔ جو ساری عمر کی تقلید و تربیت سے دور نہ ہوگا۔ جس گھر میں ماں شریر کاہل۔ نابکار ہو۔ گھرڑ بیچیں نکالتی ہو۔ جھنجلاتی ہو۔ رنج پھیلاتی ہو وہ گھر جہنّم ہے۔ جس سے بھاگنے کو دل چاہتا ہے۔ جن بچّوں کی بدنصیبی سے ایسے گھروں میں پرورش ہوتی ہے۔ وہ اخلاق کی رُو سے لُولے اور بے ڈول ہونگے۔ وہ نہ اپنے لیئے اچھے ہونگے نہ اوروں کے لئے بلکہ سب کے واسطے

بڑے ہوں گے۔

مردوں کی خصلت بنانے میں عورتیں جو اثر کرتی ہیں۔ گو نوشت خواند
میں نہ آئے۔ مگر وہ اُن کے بعد باقی رہتا ہے۔ اور ہمیشہ اپنے نتائج خیر کو
جاری رکھتا ہے۔ عورتوں نے نہ تو پڑھ پڑھ کے تصویریں بنائیں۔ نہ بڑی
بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ نہ الجبرا ایجاد کیا۔ نہ دُوربین اور دُخانی کلیں
اختراع کیئے ہیں بلکہ صاف باطن و نیک صفات اہل دل موجدوں کو اپنی
گودمیں تعلیم و تربیت کیا ہے۔ اِس سے بہتر کیا ایجاد دنیا میں ہوسکتا ہے
اگر عورت اور مردوں کی خصلتوں کا فیصلہ اِس لحاظ سے کیا جاوے۔ کہ
کس نے زیادہ بھلائی دُنیا میں پھیلائی تو عورتوں کی ترجیح رہے گی۔

عورتوں پر لازم ہے۔ کہ وہ سلیقہ مندی کی عادت پیدا کریں۔ کہ
جس سے وہ دُنیا کے روزانہ کاموں میں مؤثر۔ مددگار۔ معاون ہوں عورتیں
ہی بچّوں کو دُودھ پلانے والی۔ پرورش کرنے والی تعلیم کرنے والی ہوتی
ہیں۔ ماؤں کی فقط محبّت طبعی کافی نہیں۔ عقل حیوانی نسل حیوانات کو
قائم رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کو ضرورت تربیت و تعلیم کی نہیں ہوتی لیکن عقل
انسانی کی ضرورت ہمیشہ کھنچے میں رہتی ہے۔ تعلیم کی محتاج ہے۔ خدائے
تعالےٰ نے عورتوں کو ایک خاص قدرتِ جسمانی عطا کی ہے لیکن اس کے
ساتھ فطرتِ عقلی اور فطرتِ اخلاقی بھی سکونت پذیر ہے پس عورتوں کو
سب سے پہلے یہ سمجھنا ضرور ہے۔ کہ صحّتِ جسمانی و صحّتِ عقلی و صحّت
اخلاقی بموجب قوانینِ فطرت گھر میں کیونکر حاصل ہوسکتی ہے؟ آدمی کے ایک
تہائی بچّے پانچ سال کی عمر کے اندر مرجاتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے۔
کہ مائیں قوانینِ فطرت سے آگاہ نہیں ہوتیں۔ وہ جسم کی ترکیب سے

بے خبر ہیں۔ تازی ہوا۔ اور صاف پانی کے فوائد سے ناواقف ہیں۔ اور ہضم غذا کے تیار کرنے اور بنانے کو نہیں سمجھتیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ کہ عورتوں کو مردوں جیسی عقل اس لئے دی گئی ہے۔ کہ وہ کام میں لائی جائے نہ یہ کہ کچی رکھ کر سڑائی جائے۔ یہ عطیات بغیر کسی مطلب اور مقتضا کے نہیں عطا ہوئے۔

عورت اس لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ کہ وہ بے عقل اور نافہم رہ کر مرد کی خدمت یا مزدوری کرے۔ یا ایک سہانا کھلونا بن کر وقتِ فرصت اس کا دل خوش کرے۔ اس کے فرض ایسے نازک جوابدہی کے فرائض ہیں کہ جن کے لئے دماغ تعلیم یافتہ اور دل شفقت انگیز چاہئے۔ عورتوں کی تعلیم کے باب میں ہمیشہ سے اختلاف رائے چلا آتا ہے۔ ایک طرف نہایت تنگدلی سے یہ رائے نامعقول بیہودہ گھڑ دی جاتی ہے۔ کہ عورتوں کو علم کمسٹری کا اتنا آنا کافی ہے کہ وہ ہنڈیاں پکالیں۔ اور علم جغرافیہ اتنا بہت ہے۔ کہ وہ اپنے گھر کے کمرے کو جانتی ہو۔ بڑا کتب خانہ ان کے لئے یہ ہے کہ ایک کتاب مقدس ان کے پاس ہو۔ دوسری طرف اس کے مخالف وہ رائے ہے۔ جس میں مبالغہ۔ لغو۔ فضول۔ فطرت کی مخالفت موجود ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ تعلیم میں عورت اور مرد دونوں ہم پلہ ہوں۔ حقوق میں اور رائے دینے میں دونوں برابر ہوں۔ منصب و جاہ و دولت و حکومت کے لئے جو خود غرضی کی جڑ اور خطرے کا گھر ہیں۔ دونوں مساوی سمجھے جائیں۔ فقط عورت ہونے کی وجہ سے کسی جاہ و منصب سے محرومی نہ ہو۔

ابتدائے عمر میں جو تعلیم و تادیب نہایت مناسب لڑکوں کے واسطے

ہے۔ وہی لڑکیوں کے لئے ہے۔ تربیت و تعلیم کی استعداد جیسی مردوں
میں ہے ویسی ہی عورتوں میں ہے۔ مردوں کے اعلیٰ درجے کی تعلیم کے
حق میں جو دلائل متین اور براہین عظیم بیان کئے جاتے ہیں۔ وہی عورتوں
کے اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لئے نہایت متانت سے وکالت کر رہے ہیں بلکہ
گھر کے تمام کارخانوں میں عقلمندی عورتوں کی بکار آمد اور مؤثر ہونے کو
زیادہ کر دے گی۔ یہ عقلمندی عورتوں میں تفکّر اور مآل اندیشی پیدا
کرے گی۔ وہ پہلے سے اُن کو سمجھا دے گی۔ کہ زندگی کی ضروریات کیا ہیں
اور وہ کیونکر بہم پہونچ سکتی ہیں۔ غرض ہر طرح سے اُن کی تقویت کا
سبب ہوگی۔ اُن کی قوائے عقلیہ کی تادیب سے یہ فائدہ حاصل ہوگا۔ کہ
وہ جیسے اپنے بھولے پن اور جہالت سے دغا اور فریب اور توہّمات کے
جال میں پھنس جاتی ہیں۔ نہ پھنسیں گی۔ اور اخلاقی اور مذہبی تربیت
اُن کا افتخار بڑھائیں گی۔ اور اُن میں وہ سچّی خود اعتمادی اور
فرائض پروری پیدا کرے گی۔ جو خانہ داری کے چین و آرام اور خوشدلی
کا سرچشمہ ہے۔

مردوں کے اخلاق اور دماغ کا صحیح رہنا عورتوں پر موقوف ہے۔
اِس لئے عورتوں کی تعلیم ایک قومی اور مہتم بالشان امر سمجھا جاتا ہے
عورتوں کی پاکیزگی اخلاق اور عقلی تربیت مردوں کی اخلاقی خصلت اور
عقلی قوّت کی بڑی محافظ و حامی ہیں۔ جیسے یہ دونوں مل کر اپنے قوٰی
کو کامل طور پر ظاہر کریں گے۔ ویسا ہی قوم کا انتظام زیادہ عمدہ
ہوگا۔ اور اس کی برتری اور اقبال مندی یقینی ہوگی۔

شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد دہلوی

پیدائش نگینہ ضلع بجنور ۱۸۳۶ء وفات دہلی ۱۹۱۲ء

۶ دسمبر ۱۸۳۶ء روز سہ شنبہ کو نواح تحصیل نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے اپنے والد مولوی سعادت علی کے ہمراہ خاص شہر بجنور میں رہتے تھے۔ مگر سن تمیز کو پہونچنے کے بعد سے برابر دہلی ہی میں رہے۔

آپ نے فارسی کتابیں اپنے والد ہی سے پڑھیں۔ عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی نصر اللہ خاں سے اس کے بعد مولوی عبد الخالق صاحب سے پڑھیں۔ جنوری ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ کالج مذکور سے نکلنے کے بعد ابتداءً آپ ضلع گجرات کے ایک اسکول میں للعہ ماہوار پر ملازم ہوئے ۱۸۵۳ء میں دو برس کے بعد وہ ملازمت ترک کر کے کانپور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس للعہ مشاہرہ پر مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد آپ الہ آباد کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ عبد اللہ خاں امین عدالت کے مکان پر آپ کا قیام تھا۔ انھیں کی تحریک سے آپ نے انگریزی شروع کر دی۔ اور اس کو بقدر ضرورت خوب حاصل کر لیا۔ حیدرآباد میں جاکر آپ نے تلنگی سیکھی پیرانہ سالی میں دہلی میں آپ نے سنسکرت پڑھی۔

آپ نے گورنمنٹ کے حکم سے انکم ٹیکس اور تعزیرات ہند کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا۔ اس صلے میں آپ کو ۱۸۶۱ء میں کانپور کی تحصیلداری ملی اس کے بعد آپ نے ضابطہ فوجداری و قانون شہادت کا ترجمہ کیا۔ اس صلہ میں ۱۸۶۳ء میں کانپور ہی میں آپ ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ وہاں سے گورکھپور۔ جالون۔ اعظم گڑھ وغیرہ تبدیل

ہوتے رہے۔

نواب محسن الملک اور نواب عماد الملک مولوی سید حسن صاحب بلگرامی کی تحریک سے سر سالار جنگ نے ۱۸۷۷ء میں آپ کو حیدر آباد میں طلب کیا۔ وہاں ایک ہزار تنخواہ دو سو چالیس بھتّہ پر ایک بڑے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔ وہاں کا کام نہایت خوبی سے انجام دے کر سبکدوش ہوئے۔ دہلی میں آکر خانہ نشین ہوئے ۲۸ اپریل روز جمعہ ۱۹۱۲ء ۸ بجے دن کو بعارضہ فالج انتقال ہوا۔

آپ نے اُردو زبان کو بہت بڑی مدد پہونچائی۔ آخر وقت تک تالیف و تصنیف سے آپ کا قلم نہیں رُکا۔ منتخب الحکایات۔ چند پند۔ توبۃ النصوح۔ مرآۃ العروس۔ بنات النعش۔ ابن الوقت محصنات۔ رویائے صادقہ۔ الحقوق والفرائض۔ ترجمۃ القرآن۔ موعظۂ حسنہ۔ اور بہت سی کتابیں اور لکچر اسپیچیں آپ کی یادگار ہیں۔

آپ کی تحریر میں سادگی ہے۔ مثال و محاورات کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ عربی زبان سے آپ کو ایک خاص اُلفت تھی۔ اس لیے آپ کی اُردو میں بھی عربی زبان کے الفاظ اور فقرے۔ اشعار۔ احادیث۔ آیاتِ قرآنی کا استعمال زیادہ ہے۔ آپ کی کتابیں دہلی کی پاکیزہ اور شستہ اُردو کا عمدہ نمونہ ہیں۔

انگریزوں کی عظمت کی اصلی وجہ

انگریزوں کی عظمت کا سبب اور ہندوستانیوں کی ترقی کرنے کے طریقہ کی بابت نوبل صاحب نے سر سیّد سے جواپنی رائے ظاہر کی ہے (کہ انگریزوں کی

عظمت کی اصلی وجہ تجارت اور صنعت میں ترقی کرنا ہے۔ نہ کہ سلطنت۔ اور ہندوستانی جب تک انگریزی زبان سیکھ کر علوم جدیدہ کو حاصل کر کے صنعت و تجارت کے جانب متوجہ نہ ہوں گے۔ اور انگریزوں سے میل جول نہ پیدا کریں گے۔ ترقی نہیں کر سکتے) وہ مضمون شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی کی کتاب ابن الوقت سے منتخب کیا گیا۔

اہلِ یورپ کی عظمت سلطنت میں نہیں ہے۔ بلکہ تمام عظمت اُن علوم میں ہے۔ جو جدید ایجاد ہوے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں۔ اور جن علوم کے ذریعہ سے اُنھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزارہا قسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں۔ اور بناتے چلے جاتے ہیں۔ اور ہر طرح کی کاریگری میں دوسرے ملک کے لوگوں پر سبقت لیجا کر روے زمین کی دولت اپنے مُلک میں گھسیٹ لے گئے۔ اور گھسیٹے لیے جا رہے ہیں۔ جس جس طرح کے ہنر اور کمالِ اہلِ یورپ میں ہیں۔ اُن کے ہوتے ممکن نہ تھا۔ کہ اُن کو سلطنت نہ ہو۔ سلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں ہے۔ بلکہ روکھن میں سے اور ان کا حق لازمی ہے۔ سلطنت سے انگریزوں کو اگر کچھ مفاد ہے۔ تو یہی۔ کہ اُن کے مُلک کے چند آدمی یہاں آکر نوکری کرتے اور تنخواہ پاتے ہیں۔ اِس سے بھی ہمکو انکار نہیں کہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں انگریزوں کو بڑی تنخواہ ملتی ہے۔ اور کیوں نہ ملے۔ اِن کے سفر دور دراز کو دیکھو اختلاف آب و ہوا کی وجہ سے اُن کی جان جوکھم پر نظر کرو۔ اُن کی اچھی شان والا کثیر المصارف طرزِ زندگی اور ساتھ اُن کی دیانت داری کا بھی خیال کرو۔ تو معلوم ہو کہ انگریزوں کی تنخواہیں بواجب بڑی ہیں۔ یا بہ ناواجب۔ یہ بھی انگریزوں ہی کے جگر ہیں کہ اِن تنخواہوں پر کیسے کیسے سخت

امتحان دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات ان کے اصول زندگی میں داخل ہے۔ کہ
ہر انسان کو اپنی قوت بازو سے کمائی کرنی چاہیئے جب کہ خاندان شاہی
میں کوئی شخص اس کلیئے سے مستثنا نہیں۔ اور خود ملکہ معظمہ کے پوتے قاعدے
کے مطابق چھوٹے چھوٹے عہدوں سے نوکری شروع کرتے ہیں۔ تو دوسرے
کس گنتی میں ہیں۔ یہی تنخواہیں اور یہی امتحان۔ اور یہی پردیس۔ اور یہی
اختلاف آب و ہوا۔ اور یہی حالات تمام ہندوستانیوں کے ہوں۔ تو شاید
گھر سے نکلنے کا نام نہ لیں۔ ولایت تو ولایت آج کسی کو باہر جانے کا حکم
دیا جاتا ہے۔ تو سارے گھر میں رونا پیٹنا مچ جاتا ہے۔ اپنی ہمت کا تو یہ
حال :- اور انگریزوں کی تنخواہوں پر حسد-! بہر کیف یہی سہی کہ جتنے انگریز
ہندوستان میں نوکر ہیں۔ جتنے کہ گورے۔ سب کے سب یہاں کی تنخواہیں
پا پاکر آسودہ حال ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان معدودے چند کے تموّل سے اُس
ملک کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔؟ جس میں سے ان سے دو چند سہ چند
ہر سال جزائر دور دست میں جاکر سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ صرف اس وجہ
سے کہ علم طب اور صفائی میں جو بہت ترقی ہوئی ہے تو عمروں کا اوسط
بڑھ گیا ہے۔ بیماری اور موت میں بہت کمی ہوگئی ہے۔ توالد تناسل
کثرت سے ہوتا ہے۔ ملک کی وسعت اس قدر کثیر التعداد باشندوں کو کافی
نہیں۔ اور اہل یورپ کے تموّل کا اندازہ کسی قدر آپ اس بات سے
کر سکیں گے۔ کہ وہاں دو روپیہ روز کی آمدنی کا آدمی سوسائٹی میں اس سے
زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جیسے یہاں ڈیڑھ دو آنے روز کا مزدور۔ اور
دس ہزار روپیہ سالانہ کہ یہ سولین کی پنشن کی مقدار غایت ہے۔ سواری
اور اپنے ذاتی ملازم رکھنے کے لیے مشکل سے کفایت کر سکتا ہے۔ تو موٹی

سے موٹی سمجھ کا آدمی بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ کہ سلطنت کی وجہ سے یورپ میں یہ کچھ دولت پھٹ پڑی ہے۔ اصلی بات یہ ہے۔ کہ خدا کو اہل یورپ کی ترقی۔ اُن کی فلاح منظور تھی۔ کہ مُلک کے مُلک کو واقعات نفس الامری اور موجوداتِ خارجی میں غور کرنے کی دُھن لگا دی۔ اِس غور سے سیکڑوں ہزاروں نئے نئے اصول دریافت ہوئے۔ جن پر عمل کرنے سے انسان کی قدرت اِس قدر بڑھ گئی کہ کچھ انتہا نہیں۔

غرض یورپ کی دولتمندی کے اصل نکلے سیٹیم (بھاپ) اور الکٹریسٹی (قوتِ برقی) وغیرہ یعنی اِن کے علوم جدیدہ ہیں۔ ہالوے کا تو نام آپنے سُنا ہوگا۔ اِس شخص کے یہاں مرہم اور گولیوں کا کارخانہ ہے۔ مگر اِسکی آمدنی کو آپ اس پر قیاس کرسکتے ہیں۔ کہ چار لاکھ روپیہ سالانہ تو صرف اُجرتِ اشتہار کا خرچ ہے۔ اور پھر کچھ بڑے کارخانوں میں اِس کا شمار نہیں۔ ولایت جاکر دیکھئے۔ تو معلوم ہو۔ کہ تجارت کے مقابلے میں سلطنت ایک محض بے حقیقت چیز ہے۔ اگر تاجروں کے تموّل کا حال میں آپ سے بیان کروں۔ تو آپ مبالغہ سمجھیں۔ پھر ہماری ولایت میں کوئی سیر حاصل مُلک نہیں۔ پیداوار اور معدنیات کے اعتبار سے یورپ کسی طرح ہندوستان سے لگا نہیں کھا سکتا۔ مگر چونکہ ہندوستان کے لوگ نئے علوم سے ناواقف ہیں۔ خداداد سرمائے سے فائدہ اُٹھانے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ ہندوستانیوں کی بدقسمتی اِس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ مثلاً روئی ہندوستان سے ولایت جاتی ہے۔ اور وہ لوگ اپنی ہنرمندی سے اِس روئی کے انواع و اقسام کے کپڑے بناکر پھر ہندوستانیوں کے ہاتھ چند در چند نفع پر فروخت کرتے ہیں۔

پس ہندوستانیوں کے پنپنے کی اگر کوئی تدبیر ہے - تو یہی - کہ اِن میں علوم جدیدہ کو پھیلایا جاے - اور اُن کو اِس بات کی طرف متوجہ کیا جاے کہ اپنی تمام قوت عقلی واقعات میں صرف کریں - یہاں کے لوگ بالطبع ذہین ہوتے ہیں - اِدھر طبیعتیں لڑائی شروع کریں - اور اِس کا اُن کو چسکا پڑجاے تو بس ساری شکایتیں رفع ہیں - اور از بس کہ تمام علوم جدیدہ جن پر ملکی ترقی کا انحصار ہے - انگریزی میں ہیں - سب سے پہلے زبان انگریزی کو رواج دینا ہوگا - بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے - کہ علوم جدیدہ کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرائی جائیں - مگر میں اِس راے سے متفق نہیں ہوں - اوّل تو زبان اُردو میں اتنی وسعت نہیں - کہ علوم جدیدہ کی تمام مصطلحات کا اُردو ترجمہ ہوسکے - ناچار اکثر مصطلحات انگریزی کو اختیار کرنا پڑے گا اور اُن کے تلفظ میں ضرور غلطیاں ہوں گی - میں نے اِس طرح کی بعض طبّی اور بعض کیمیا اور بوٹنی (علم فلاحت) کی کتابیں دیکھی ہیں - کوئی سطر انگریزی الفاظ سے خالی نہیں - یہ ترجمے اُردو انگریزی مخلوط آدھا تیتر - آدھا بٹیر - مجھکو تو سخت بدمزہ معلوم ہوتے ہیں - اور پھر کسی زبان کے ایک لفظ کی دوسری زبان میں کیسی ہی ہندی کی چندی کیوں نہ کرو - اُس کا ٹھیک مفہوم دوسری زبان میں ادا ہونا مشکل ہے - اِس کے علاوہ انگریزی زبان کے رواج دینے سے ایک علوم جدیدہ کا پھیلانا ہے - اور دوسری غرض اور بھی ہے - یعنی عموماً انگریزی خیالات کا پھیلانا - اکیلے علوم جدیدہ سے کام چلنے والا نہیں - جب تک خیالات میں آزادی - ارادے میں استقلال - حوصلے میں وسعت - ہمّت میں علو - دل میں فیاضی - اور ہمدردی - بات میں سچائی - معاملات میں راستبازی - یعنی انسان پورا پورا

جنٹلمین نہ ہو۔ اور وہ بدوں انگریزی جاننے کے ہو نہیں سکتا انگریزی داں آدمی کو اخباروں اور کتابوں کے ذریعے سے انگریزی خیالات کا پتہ آگہی بہم پہونچانے کی بڑی آسانی ہو سکتی ہے

مذہب اور عقل

یعنی عقل ایک ایسی محدود قوت ہے۔ جس کی پوری پوری رسائی دنیاوی امور میں تو ہو نہیں سکتی۔ مذہب جس کو دوسرے عالم سے بھی تعلق ہے۔ اُس میں اُسکی رسائی کیونکر ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مذہب کو محکوم عقل بنانا سخت غلطی ہے۔

بلاشبہہ مبداء فیاض نے انسان کو ظاہری اور باطنی جتنی قوتیں دی ہیں سب میں عقل بڑی زبردست ہے۔ اور وہی مدار تکلیف شرع بھی ہے۔ لیکن بیش برین نیست۔ کہ عقل بھی ایک قوت ہے۔ اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں۔ اسی طرح عقل بھی محدود اور ناقص ہے۔ مثلاً آنکھ۔ کہ خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے۔ اُس سے باہر نہیں بغیر روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسام کثیف میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر دیکھنے والا متحرک ہو (مثلاً فرض کرو کہ کشتی یا ریل میں ہو) تو وہ اُلٹا ٹھہری ہوئی چیزوں کو متحرک دیکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں ٹھہرا ہوا۔ تیز حرکت متشکل معلوم ہوتی ہے۔ جیسے لڑکے لکٹی سے کھیلتے ہیں۔ پیالے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کریں۔ تو لچکی ہوئی دکھائی دیگی شفاف پانی کی تہ کی چیزیں اوپر کو اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اسی طرح کی اور بہت سے غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے۔ غرض جس طرح مثلاً ہماری قوت باصرہ محدود اور ناقص ہے۔

اُسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے۔ وہ بھی نقصان سے بری نہیں اور اِس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے لئے اختلافِ رائے کی دلیل کافی ہے۔ ہندسہ کے علاوہ جس کے اُصول بدیہیات پر مبنی ہیں۔ (اور اِسی وجہ سے اس میں اختلاف ہو نہیں سکتا) ڈاکٹر۔ فلسفی۔ جج۔ ہیئت داں مدبّرانِ مُلک۔ اہلِ مذہب۔ وغیرہ وغیرہ سبھی کو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں۔ منطق کے قاعدے منضبط ہوئے مناظرے کے اُصول ٹھہرائے گئے مگر اختلاف نہ کم ہوا۔ اور نہ تا قیامت کم ہو۔ جب ہست و نیست کا اختلاف ہو۔ تو ضرور ایک بر سرِ غلط ہے۔ اگرچہ عقلِ انسانی کا نقصان اختلافِ رائے سے بھی مستنبط ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ذرا اِس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہلِ یورپ کو سیکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں۔ کہ کسی کو کیمیا کا حکمی نسخہ مل گیا ہوتا۔ اور وہ اُس کو عام بھی کر دیتا تو اتنا فائدہ نہ پہونچتا۔ جتنا کہ اِن ماڈرن ڈسکوریز یعنی زمانۂ حال کی دریافتوں سے ہوا۔ اور جن اقبالمندوں کو خدا نے واقعات اور موجوداتِ نفس الامری میں غور و خوض کرنے کی دُھن لگا دی ہے۔ خدا اُن کی کوششوں کو مشکور و کامیاب کرتا ہے۔ بحرِ بے پایاں موجودات میں غوطے لگا رہے ہیں۔ اور معلوماتِ جدیدہ کے بے بہا موتی ہیں۔ کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں۔ ان ماڈرن ڈسکوریز میں سے زیادہ نہیں صرف ایک چیز عام فہم لو۔ جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ ریل۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ دُنیا میں گھر گھر آگ تھی۔ گھر گھر ہنڈیاں پکتی تھیں۔ ہر ہر متنفس بھاپ سے بخوبی واقف تھا۔ سیکڑوں ہزاروں

برس پہلے سٹیم (بھاپ) کی طاقت کیوں معلوم نہیں ہوئی۔ اور یہی سوال ہرڈسکوری کی بابت ہوسکتا ہے۔ جو اب تک ہوئی۔ یا آئندہ کسی وقت میں ہو۔

سر اسحق نیوٹن جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا کہتا تھا۔ کہ خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بکھرے پڑے ہیں۔ اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگھے جمع کر رہا ہوں۔ یہ مقولہ تھا۔ اس شخص کا۔ جس نے زمین اور آسمان کے قلابے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا۔ اور آج سارا یورپ اس کے نام پر فخر کر رہا ہے۔

جس کو خدا نے عقل دی ہے وہ تو یوں اپنی عقل کی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ایک ہمارے زمانے کے انگریزی خوان ہیں۔ کہ سیدھی سی اقلیدس کی ایک شکل پوچھو۔ تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ اور لن ترانیاں یہ کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔ پس جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ عقل انسانی کا قصور ہے۔ کہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ اب سے زیادہ نہیں۔ صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ مہینوں کی مسافت ہم گھنٹوں میں طے کر سکیں گے۔ یا ہزارہا کوس کا حال چند لمحے میں معلوم کر لیا کریں گے۔ یا آگ سے برف جمائیں گے۔ یا کپڑے کی کل میں کپاس بھر کر اچھے خاصے دھلے دھلائے تہ کئے ہوئے تھان نکال لیا کریں گے۔ اور ابھی کیا معلوم کہ ہم کیا کیا کر سکیں گے۔ مگر پھر بھی رہیں گے آدمی عاجز۔ ناچیز۔ بے حقیقت۔ بھلا آدمی کیا عقل پر ناز کرے گا۔ جب کہ اس کو پاس کے پاس اتنا تو معلوم ہی نہیں۔

کہ رُوح کیا چیز ہے۔ اور اُس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلّق ہے۔
وقت کے ازلی۔ ابدی ہونے پر خیال کرتے ہیں۔ تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طرفۃ العین بلکہ اِس سے بھی کم۔ اور اِس ہستی پر انسان کے یہ ارادے اور یہ حوصلے۔ کہ گویا زمین اور آسمان میں سمانا نہیں چاہتا۔ پھر کیسے کیسے لوگ ہو گذرے ہیں۔ کہ اِس سِرے سے اُس سِرے تک ساری زمین کو ہلا مارا۔ اور مرگئے تو کچھ بھی نہیں ایک تودۂ خاک! آخر وہ کیا چیز تھی جو اُن میں سے نکل گئی ؟ حیوانات نباتات لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکّر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین سے پیدا ہوتے۔ اور پھر اسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کس غرض سے ہو رہا ہے ؟ جان تو ایک قسم کی نباتات میں بھی ہے مگر جانوروں کے بہت سے افعال انسان سے ملتے ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض حیوانات بعض باتوں میں انسان پر بھی شرف رکھتے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ تو اُن کے تمام کمالات وہبی اور فطری ہیں۔ پھر وہ کون سی تکمیل ہے جس کے لئے اِن کو یہ ہستی دی گئی ہے ؟

انگریزوں نے تحقیقات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر شروع سے اب تک کسی ایک جگہ۔ یا کسی ایک چیز۔ یا کسی ایک بات کا مسلسل پتہ نہ چل سکا۔ زمانۂ حال سے جس قدر پیچھے کو دُور ہوتے جاتے ہیں منظرِ تاریخ دھندلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب سے چار پانچ ہزار برس پہلے کا کسی کو کچھ حال ہی نہیں معلوم۔ کہ دُنیا کا کیا رنگ تھا ؟ عقلِ انسانی کی نارسائی اِس سے بڑھکر اور کیا ہوگی۔ کہ آج تک کسی پر کسی چیز کی ماہیّت

ہی منکشف نہیں ہوئی۔ جانا تو کیا جانا؟ اعراض۔ وہ بھی شاید فی صد دو
مثلاً پانی۔ کہ ہم اُس کا اتنا ہی حال جانتے ہیں۔ کہ سیّال (بہنے والا) ہے
جو شکل چاہو۔ آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ آمیزش سے پاک ہو۔ تو شفاف
ہے۔ نشیب کی طرف کو بہتا ہے۔ وزن مخصوص کے قاعدے سے ۳۴ فٹ
سے زیادہ ہوا میں بلند نہیں ہو سکتا۔ حرارت کے اثر سے ہوا بن جاتا ہے
یا اگر علم طبعی کے کسی ماہر سے پوچھو تو شاید دو چار خواص اور بیان
کر سکے گا! مگر یہ سب آثار ہیں۔ نہ ماہیت۔ ماہیت کا نام آیا اور عقل
گم ہو گئی۔

بات کیا ہے۔ کہ دنیا ہے عالمِ اسباب۔ یہاں واقعات کا ایک سلسلہ
ہے۔ ایک کے بعد دوسرا۔ اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ واقع ہوتا رہتا ہے۔
ہم واقعۂ متقدم کو سبب اور علت کہتے ہیں۔ اور واقعۂ متاخر کو مسبب اور
معلول یا نتیجہ۔ اگرچہ سبب کے قرار دینے میں اکثر چند در چند غلطیاں ہوتی ہیں
مگر فرض کرو۔ کہ ہم سبب کے قرار دینے میں غلطی نہ بھی کریں۔ تاہم سبب
اور مسبب میں جو علاقہ ہے۔ آج تک اُس کا راز کسی پر نہیں کھلا۔ مثلاً
جلانا آگ کا خاصہ ہے۔ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ مگر کوئی نہیں بتا سکتا
کہ کیوں۔ ذرا آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھو۔ تو رُوئے زمین کے سارے
ریگستانوں میں اتنے ذرّے نہ ہوں گے۔ جتنے ستارے آسمان میں بھرے پڑے
ہیں۔ پھر یہ ستارے دیکھنے میں چھوٹے چھوٹے نقطے سے نظر آتے ہیں۔
اور درحقیقت ایک ایک بجائے خود ایک جہان ہے۔ کہ ہماری زمین کی اُس کے
سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں۔ غرض سوچنے سمجھنے والے کو دنیا سرتاسر
طلسمِ حیرت ہے۔

جب دنیاوی امور میں عقل انسانی کی نارسائی کا یہ حال ہو۔ کہ کسی
بات کی تہ کو نہیں پہونچ سکتی۔ تو دین میں وہ کیا ہماری رہبری کریگی؟

تو کار زمیں را نکو ساختی   کہ با آسماں نیز پرداختی

یہ دنیا تو پھر بھی عالم شہود ہے۔ ہم اس میں موجود ہیں۔ اور اس کو
اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ اور تھوڑا بہت اس میں تصرّف بھی کر سکتے ہیں
اور کرتے ہیں۔ دین خبر دیتا ہے۔ کہ اس دنیا کے سوا ایک جہاں اور
ہے۔ یہ ظاہر ہے وہ غائب۔ یہ فانی ہے وہ باقی۔ یہ مجاز ہے۔ وہ حقیقت۔
یہ تمہید ہے وہ نفس مطلب۔ یہ اعمال ہے وہ نتیجہ۔ یہ سفر ہے وہ منزل
مقصود۔ یہ خواب ہے وہ تعبیر۔ یہ افسانہ ہے وہ حق الامر۔ ظاہر ہے کہ عقل
انسانی کو اس جہان کے متعلق کچھ بھی نہیں جاننا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی
شناسائی رسائی سے بہت دور پڑے ہیں۔ لیکن خدا کی بے انتہا مہربانی سے
بعید تھا۔ کہ انسان جو اس کی مخلوقات میں سب سے افضل ہے اس جہان
سے بالکل بے خبر رہے۔ اور جس طرح اس نے اور چیزوں کو دوسرے
خواص بخشے ہیں۔ عقل انسانی کو نیک و بد کی تمیز عطا فرمائی۔ کہ جاہل سے
جاہل اور وحشی سے وحشی بھی بھلائی کی طرف راغب ہے۔ نہ کسی دنیاوی مفاد
کی طمع سے۔ اور برائی سے ہارب (بھاگنے والا) ہے نہ کسی نقصان کے خوف
سے۔ بلکہ گویا انسان کا دل مقناطیسی سوئی ہے۔ اور نیکی شمال کی سمت
پس اس جہان کے متعلق رسائی معلومات۔ واقفیت جو کچھ سمجھو۔ یہ
انسانی فطرت ہے۔ کہ آدمی بالطبع نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کرتا
ہے۔ پھر انسان کی عقل اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرتی۔ بہتیرا زور مارتی
ہے کہ وہاں کی حقیقت دریافت کروں۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سہ

حالِ عدم نہ پوچھ کتنا گزرے ہے رائگاں پہ کیا   کوئی حقیقت آن کر کہتا نہیں تری گلی
نیکی بدی کے امتیاز کے ساتھ اس کو اتنی بات اور بھی سوجھتی ہے کہ
انسان کے ہر ایک فعل کو ایک نتیجہ لازم ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض افعال
کے نتائج اسی دنیا میں واقع ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض کے نہیں بھی ہوتے۔
اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی نتائج کے علاوہ طبیعتیں کسی اور نتیجے کی بھی
منتظر رہتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک جہان۔ اور ہونا چاہیئے
اور اس کی ضرورت ہے۔ اور نہیں معلوم کیا سبب ہے۔ کہ دل خود بخود
اندر سے گواہی دیتا ہے۔ کہ مرنے سے تو ہمارا پیچھا چھوٹتا ہوا نظر نہیں
آتا۔ مرنے پیچھے ہم کسی حالت میں رہیں۔ مگر رہیں گے ضرور۔ بس یہاں تک
عقل کی پرواز تمام ہوئی۔ ع

اگر یک سر موئے برتر پرم   فروغِ تجلی بسوزد پرم

مگر اس سے تو کچھ بھی کشودِ کار نہ ہوا۔ دل جو اس جہان کے تفصیلی
حالات کے مشتاق تھے۔ بدستور چھپا کے چھپا رہے۔ اب دین کی سرحد
میں آگے بڑھنا چاہتے ہو۔ تو چراغِ عقل کو گل کرو۔ اور آفتابِ
جہان تابِ کلامِ الٰہی کو اپنا ہادی اور راہ نما قرار دو۔

کارخانۂ عالم

یعنی دنیا کی تمام مخلوقات پر غائر نظر ڈال کر۔ اس صانعِ مطلق کی حیرت انگیز
صنعت اور کاریگری کو دیکھکر خداوندِ عالم کی ہستی اور وجود کا قائل ہونا چاہیئے
اور یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ اسی خالقِ یکتا نے ہم سب کو نیست سے ہست کیا
معدوم سے موجود کیا۔ وہی باقی ہے۔ اور سب چیزیں فانی۔ اس کی ہستی سے
کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

دنیا کا ایک بڑا بھاری عظیم الشان کارخانہ ہے۔ کہنے کو محدود ہے۔ مگر کسی نے اس کی انتہا نہیں پائی۔ اس کارخانے کے مقابلے میں زمین کی یا یوں وسعت اتنی بھی تو حقیقت نہیں۔ جیسے بڑے سے بڑے پہاڑ کے آگے ایک ذرّے کی۔ اگر علم ہیئات کی سب باتیں سچی ہیں۔ اور جب مشاہدات اور اصولِ ہندسہ پر مبنی ہیں۔ تو ان کو غلط ہی کون کہہ سکتا ہے؟ تو چار و ناچار انسان کو اپنی درماندگی کا نارسائی اور بے حقیقتی کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ ہزار دس ہزار۔ بیس ہزار۔ پچاس ہزار۔ لاکھ کوس تک کا بھی خیر ہم یوں ہی سا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ مہاسنکھ در مہاسنکھ کوسوں کے سمجھنے کو کس کی اٹکل لائیں۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے۔ ان دوریوں کا کہ زمین پر سے گولہ چھوٹے۔ اور شبانہ روز متصل ایک رفتار سے سیدھا چلا جائے تو آئیں برسوں میں جاکر آفتاب تک پہونچے۔ اللہ اکبر جلّ شانہٗ۔ بڑے سے بڑے بلّے کی دوربینیں ایجاد ہوئیں۔ مگر ہم نے اجرامِ فلکی کا کیا دیکھا؟ ایک جھلک۔ وہ بھی ان معدودے چند کی۔ جو زمین سے بہ نسبت دوسرے بے شمار اجرام کے قریب ہیں۔ جب آسمان خوب صاف ہوتا ہے۔ تو اندھیری رات میں کس کثرت سے ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا گہری افشاں چھڑکی ہوئی ہے ... اگر کسی طرح اونچے سے اونچے ستارے پر پہونچنا ممکن ہوتا۔ تو وہاں سے بھی جہاں تک اور آگے کو نظر کام کرتی یہی کیفیت دکھائی دیتی پھر خدا جانے۔ کتنے کا ہے کوسوں کی مسافت ہے۔ کہ ستارے ہم کو ننھے ننھے نقطے دکھائی دیتے ہیں۔ ورنہ جس طرح اس کا یقین ہے۔ کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اسی طرح جاننے والوں کو اس کا بھی اذعان (یقین) ہونا چاہیے۔ کہ ایک ایک نقطہ بجائے خود جہان ہے

اور جہاں بھی کیسا ہے کہ اگر اُس کو بڑا مٹکا فرض کرو۔ تو زمین اُس کے سامنے خشخاس کا نہ سہی تو رائی کا دانہ ضرور ہے۔ جو تارے زمین سے زیادہ پاس ہیں۔ یعنی اُن کی دُوری لاکھوں کوس کے پلیٹے کے اندر ہی اندر ہے۔ دُوربین کی مدد سے اُن کے حالات کسی قدر زیادہ دریافت ہوئے ہیں۔ اور پاس پڑوس کی آخر تھوڑی بہت خبر ہونی ہی چاہیئے۔ سمندر۔ جھیلیں۔ پہاڑ۔ دھوپ۔ چھاؤں۔ ہوا۔ بادل۔ یہ سب چیزیں اِن تاروں میں صاف دیکھ پڑتی ہیں۔ اس سے اور دوسرے بہت سے قرائن سے علمائے ہیأت۔ قیاس کرتے ہیں۔ اور بجا قیاس کرتے ہیں۔ کہ زمین کی طرح اِن جہانوں میں بھی جاندار آباد ہیں۔ یہاں عقل انسانی کے اوسان اور بھی گم ہیں۔ بھلا اتنے بے شمار جہانوں کی کل مخلوقات کا تو ہم کیا اندازہ کرسکتے ہیں۔ جب کہ ایک زمین کی مخلوقات کی گنتی درکنار۔ تمام اقسام تک منضبط نہیں۔

کسی کتاب میں نظر سے گذرا۔ کہ زمانۂ حال کا کوئی فلسفی خُرد بین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ سَو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں بہ مشکل شمار کرسکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو۔ تو تمام کرۂ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ کتنی مخلوقات ہوگی ؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرداگرد ۴۵ میل ہَوا کے دَل کا کُرہ ہے۔ اور اِس میں بھی جانداروں کی اتنی ہی یا اس سے زیادہ کثرت ہے۔ ہرچند کارخانۂ قدرت اِلٰہی کی عظمت اور شان فہم بشر سے خارج ہے۔ مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل مدتوں تک غور کرتا رہے۔ تو ضرور اُس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور درماندگی اور بے وقعتی کا یقین پیدا ہوگا۔ جس کو میں

دینداری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں۔

اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ کرنا چاہئیے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ یا یہں عظمت کیسی عمدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بے شمار گولے۔ کہ خدا کی پناہ اور خود زمین سب چکر میں ہیں۔ خدا جانے کب سے اور کب تک۔ اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں۔ اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہے۔ تو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہے کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہوگا۔ اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب میں اگر غلطی نہ ہو۔ تو منٹ سکنڈ کیسا ؟ سکنڈ کے ہزارویں حصے کی قدر بھی آگا پیچھا نہیں ہو سکتا۔ یہاں روے زمین پر ایک کھنگے۔ ایک دانے۔ ایک پھل۔ ایک پنکھڑی۔ گھاس کی ایک ڈنٹھل۔ چھوٹی سے چھوٹی اور ادنےٰ سے ادنےٰ چیز کو بھی نظر غور سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و غایت ہے۔ جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اس چیز میں موجود ہے۔ مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا ہے۔ تو اس کے پاؤں کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پولے ہیں۔ کہ ریت میں نہ دھنسیں۔ اس کی گردن بہت لمبی ہے۔ تاکہ اونچے درختوں سے پتے چر سکے۔ اس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے۔ جس میں کئی کئی ہفتوں کے لئے کھانا پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا۔ وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوہان کا گودام ہے۔ کہ اگر اس کو ایک عرصہ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان کی چربی بدل ما یتحلل (جو چیز تحلیل ہوتی جاتے اس کا بدلہ) کا کام

دے - ہرن وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں - تاکہ شکاری جانوروں
سے بچنے کے لئے پھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں - ہاتھی کے ایک سونڈ لٹک
رہی ہے جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے - پرندوں کے جُثّے سُبک ہیں -
تاکہ ہوا میں اُڑ سکیں - دریائی جانوروں کے پنجے کھال سے جُڑے ہوئے
ہیں - گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپّو ہیں - گوشت خوار جانوروں کے
پنجے اور دانت اُن کی غذا کے مناسب ہیں - نباتات میں پھل پھول کی حفاظت
کے واسطے کانٹے ہیں - پوست ہیں - خول ہیں - سرد مُلک کے جانوروں کی اُون
بڑی بڑی اور گھنی ہے - کہ جاڑا نہ کھائیں - جتنے جاندار معرضِ تلف میں ہیں
اُن میں توالد و تناسل کی کثرت ہے - تاکہ نسل معدوم نہ ہو - مثلاً ایک
ایک مچھلی لاکھ لاکھ سے زیادہ انڈے دیتی ہے - آدمی چونکہ بقائے حیات
کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہونچا سکتا ہے - سینگ اور پنجے اور اُون
اس قسم کے قدرتی سامان اُس کو نہیں دئے گئے - جس مُلک میں نباتات
کی کثرت ہے - وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے - کیونکہ وہ مُلک پانی کا محتاج
ہے - انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے - تو اُس کا ایک ایک رُواں
صانع قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے -
اُس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پُرزہ ہاتھ ہے - کہ دُنیا میں
جس قدر انسان کے تصرّفات ہیں - اور انسان کی بساط پر خیال کرو -
تو ان تصرّفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - سب اِسی پُرزے کے ہیں -
اہلِ یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ کلیں بنائی ہیں -
اِس میں شک نہیں - کہ اُن کلوں سے عقلِ انسانی کی قوّت بڑی شدّ و مد
کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے - مگر مجھکو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا

ہے۔ایک بکھیڑا ہے۔ کہ بیگھوں زمین پر پھیلا ہے۔سیکڑوں پرزے۔ہزارہا
پیچ بیلن۔پہیئے۔چرخیاں۔کمانیاں۔خدا جانے دُنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع
کیئے ہیں۔تب کہیں جاکر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے جس کے لیئے کل
بنائی گئی ہے۔یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔اور ایک ادنےٰ
سی کل خدائی بنائی ہوئی ہے۔یہی آدمی کا ہاتھ کہ ہزار ہا قسم کے کام
اِس سے نکلتے ہیں۔اور ترکیب دیکھو۔تو ایسی سلیس اور مختصر۔کہ ایک کفِ
دست ہے۔اور تین تین جوڑ کی پانچ اُنگلیاں۔اللہ اللہ۔خیر صلاح۔
انسان کے بدن میں ایک اور ذرا سے بھر کی چیز آنکھ ہے۔اِس کی ساخت
میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔اُن سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتی ہے
مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو۔کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاوک ہے جسمیں
نگینے کی طرح آنکھ تعبیہ کی ہوئی ہے۔اوپر بھوں کا چھجّے دار سایہ بان۔
سامنے پپوٹوں کا پردہ۔پردے میں پلکوں کی جھالر۔پھر پپوٹے کے اندر منافذ
ہیں۔جن میں سے آئینہ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت
رِستی رہتی ہے۔یہ وہی رطوبت ہے۔جو زیادہ ہوکر آنسو بن جاتی ہے جتنی
دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے۔گویا اتنی ہی دفعہ آئینے پر پچارا پھرتا ہے۔
گرد اور دھوئیں اور کنک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔
جس کے یہ معنی ہیں کہ پچارا کافی نہیں۔بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے
میرا تو کیا منھ ہے۔کہ موجوداتِ عالم میں جو اسرارِ حکمت مضمر ہیں
اُن کا ایک شمّہ بھی بیان کرسکوں۔مگر میری غرض اسی قدر ہے۔کہ دنیا
کے کارخانے کو اِس نظر سے دیکھنا چاہیئے۔کل میں نے آیۃ اللہ کا سبق
سُنا۔وہ عجائبِ قدرت پڑھتا ہے۔کسی شخص نے نیچرل فلاسفی (علم

طبعی) میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اردو میں ترجمہ کردئے ہیں
اُسی میں لکھا تھا۔ کہ مچھر کے منھ کے آگے جو ایک پتلی سونڈ سی ہوتی
ہے۔ وہ حقیقت میں ایک نلوا ہے۔ اُس نلوے میں تین اوزار ہیں ایک تو
سوئی۔ جس کو مچھر مسام میں داخل کرتا ہے۔ ایک آری۔ کہ مسام کو
چوڑا کرنے کی ضرورت ہو۔ تو اس سے کام لے۔ اور ایک سینگی جس کی
راہ خون چوستا ہے۔ اس میں اتنی بات اور بھی تھی۔ کہ اِس شکل خاص
میں مچھر کی حیات کی مدت صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا۔ کہ
تیتری کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار دیولیاں ہیں۔ اس طرح کی
باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر نہ سنے۔ جیسے کہ اُس کی عادت ہے۔ تو ہر ذرہ
اسبات کی گواہی دے گا۔ کہ اِس شے کو کسی بڑے قدرت والے۔ دانشمند۔ ہمہ داں
حاضر۔ ناظر۔ سمیع۔ بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں
کہ انسان صمیم قلب سے موجوداتِ عالم میں غور اور خوض کرے اور اُس کا
دل اندر سے نہ بولنے لگے۔ کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ بہ ایں عمدگی و انضباط
خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہوگیا۔ کیونکہ واقعات اتفاقی کی شان
ہی دوسری ہوتی ہے۔ ان میں قاعدے کا کہاں پتہ؟ اور انضباط کا کیا
مذکور؟ اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا؟ کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر
آج کی گھڑی تک تو اِن میں رتی برابر فرق پڑا نہیں۔

جس غرض کی طرف میں تم کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں یہ بھی
داخل ہے۔ کہ وقت کیا چیز ہے۔ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اگرچہ وقت
کی وسعت کا اندازہ بھی فہم بشر سے خارج ہے۔ مگر خیر جہاں تک تم سے
اجرام فلکی کے فاصلوں کی طرح اندازہ کرتے بن پڑے۔ لاکھ دو لاکھ

چار لاکھ برس کا ایک محدود وقت لے کر اسی سے وسعت کو سوچو۔ اور تمثیلاً
یوں تصوّر کرو۔ کہ وقت ایک بڑا لمبا خط ہے۔ اُس میں سے تمھاری ہستی
اگرچہ تمھارے معتقدات کے مطابق طبِ انگریزی پر پُورا پُورا عمل کرنے سے
حدِّ طبعی سے بھی کتنی ہی متجاوز کیوں نہ ہو جائے۔ تاہم اُس کو وقتِ مفروض
کے ساتھ کیا نسبت ہو گی؟ شاید جیسے محیطِ زمین کے مقابلے میں ایک
اِنچ کو یا اُس سے بھی کم۔ یہ تو انسان کی ہستی ہے۔ اور اِس پر خدا سے
انکار۔ اور اپنی عقل پر نازِ بیجا۔ انسان سے دنیا میں ہزار طرح کی
بیہودگیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مگر یہ سب بیہودگیوں پر فوق لے گئی ہے۔
کہ خدا ہی کا منکر ہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اور پرلے درجے کی بدقسمتی
کہ عقل جو انسان کو اِسی غرض سے دی گئی ہے کہ مخلوقات سے خالق کو
پہچانے۔ ورنہ دنیا کی چند روزہ زندگی تو جانور بھی بسر کر لیتے ہیں جن کو
بہت سا کھانا اور پانی درکار ہوتا ہے۔ اور مزہ یہ ہے۔ کہ حاجتیں کثیر
اور عقل کم۔ اور پھر انسان سے کہیں زیادہ خوشحال۔ غرض بڑے
افسوس کی بات ہے۔ کہ وہی عقل انسان کو ایسا گمراہ کرے۔ کہ خدا کا
قائل نہ ہونے دے۔ حقیقت میں میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کوئی آدمی
کس مُنھ سے کہہ سکتا ہے۔ کہ خدا نہیں۔ تم مجھکو اتنا تو سمجھاؤ۔ کہ
تم نے اپنے تئیں سمجھا ہے کیا؟ چندیں ہزار عالم کے مقابلے میں تمھاری
کیا حقیقت ہے۔ اور چندیں ہزار عالم بھی نہ سہی۔ ان کی مخلوقات
بھی نہ سہی۔ ایک رُوئے زمین پر ابتدا سے اب تک تم جیسے اور
تم سے بہتر اور تم سے بہتر سے بہتر کروڑہا آدمی پیدا ہوئے۔ اور
اپنی زندگی میں اُنھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ خدا کے ایسے بے شمار

بندے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے حکومتیں کیں۔ سلطنتیں کیں۔ اپنے زمانے میں نامی نامور ہوئے۔ اور پھر ایسے مٹے۔ کہ گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ نہ اُن کا نام ہے نہ نشان ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم کوئی انوکھے آدمی ہو۔ تم بھی اپنے ارادے سے پیدا نہیں ہوئے۔ اور قسم ہے اُس ذات پاک کی۔ کہ جس کے ہاتھ میں میری اور تمھاری دونوں کی۔ اور سب جانداروں کی جان ہے۔ اپنے ارادے سے زندہ بھی نہیں ہو۔ اور اپنے ارادے سے مروگے بھی نہیں۔ اور مرے بعد مہینے دو مہینے پیچھے نہ سہی۔ پچاس۵۰ سَو۱۰۰ دو سَو۲۰۰ ہزار برس بعد۔ رُوے زمین پر اتنا جاننے والا بھی تو نہیں ہوگا کہ ہم تم بھی کوئی تھے۔

ہماری تعلیم

کچھ خبر بھی ہے۔ کہ علم نے اس زمانے میں دوسری شان اختیار کی ہے۔ ہم جو اپنے علوم پر نظر کرتے ہیں۔ تو اُن کے دو ہی نتیجے پاتے ہیں یا تو زبان کی تکمیل یا ذہن کی تیزی۔ سو زمانے نے ایسا پلٹا کھایا۔ کہ دونوں نتیجے بیکار ہوگئے۔ جن زبانوں کی تکمیل کے پیچھے ہم عمر کا بڑا حصہ صرف کیا کرتے تھے۔ اب اُن زبانوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ رہی ذہن کی تیزی۔ یعنی حکمت نظری۔ اِس کا بھرم حکمت عملی نے اٹھا دیا۔ اور ہم علم کے اعتبار سے بالکل کورے کے کورے رہ گئے۔ زبان کی تکمیل سے جو اغراض دنیوی متعلق ہوسکتے ہیں۔ وہ اب انگریزی کی طرف منتقل ہوگئے ہیں۔ لیکن ہم میں سے اکثر اُن اغراض کے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں لوگوں نے اسی کو انگریزی کی غرض و غایت سمجھ رکھا ہے۔ اور اسی لئے

اس کو سیکھتے ہیں کہ حکام وقت کی زبان ہے۔ اور اسی کے ذریعہ سے
ہم حکام کے ساتھ بآسانی خیالات کا مبادلہ یعنی عرض مطلب۔ فہم
مافی الضمیر کر سکتے ہیں۔ بلاشبہہ حاکم اور محکوم میں بآسانی خیالات کا
مبادلہ بڑی ضروری اور بکار آمد چیز ہے۔ لیکن میں انگریزی کی وقعت کو
ذرا اونچا لیجانا چاہتا ہوں۔ حکام کے ساتھ خیالات کا مبادلہ تو انگریزی
کے ادنیٰ ترین اور خسیس ترین فائدوں میں سے ہے۔ انگریزی کا اصلی
اور عمدہ فائدہ جو مدِّ نظر ہونا چاہیئے۔ یہ ہے۔ کہ زبان انگریزی علوم مفیدہ کی
کلید ہے۔ یہ علوم یا تو سرے سے ایشیائی زبانوں میں ہیں ہی نہیں۔ یا ہیں
بھی۔ تو زمانۂ حال کی تحقیقات کے مقابلے میں تقویم پارینہ کا حکم رکھتے
ہیں۔ انگریزی زبان قوم اور ملک کو اسی وقت مفید ہوگی۔ جب یہ مقصود
پیش نظر رکھ کر اس کو حاصل کروگے۔ غرض یہ ہے کہ علم مقصود بالذات
اور زبان انگریزی کو اس کا آلہ سمجھا جائے۔ افسوس ہے۔ کہ اس گر کو
ابھی تک لوگوں نے سمجھا ہی نہیں۔ یا سمجھا ہے۔ تو اس پر عمل نہیں کیا
اور سمجھا اور اس پر عمل کیا ہوتا۔ تو اتنے ہی دنوں میں ہندوستان کی
کایا پلٹ گئی ہوتی۔ تحقیقات مزید اور ترقی اور ایجاد کا تو کیا مذکور ہے
جو علوم زبان انگریزی میں مدوّن ہیں۔ اور جس درجہ تک وہ پہنچ چکے
ہیں۔ اتنے ہی پر کسی نے کچھ عمل کر کے دکھایا ہوتا۔ ہمارے بدنصیب
ہندوستان میں میٹریل کی تو کمی نہیں۔ کمی ہے تو اس کی ہے۔ کہ کوئی
میٹریل کا استعمال کرنے والا نہیں۔ ایک تو نوکری کی لکیر کے فقیر بیٹھے
ہیں۔ اور نوکری کیمیا اور کبریتِ احمر ہوتی جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سو
بی۔ اے پاس ہوتے۔ تو نوے روٹیوں کے لئے سرگرداں پڑے پھرتے ہیں

اور ر نوّے بھی اب ہیں۔ یا کوئی دن جاتا ہے۔ کہ سَو پاس۔ اور سَو
میں سے سَو پاس حرماں و یاس۔ انگریزی پڑھکر کچھ فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو۔ تو
پہلے نوکری کے خبط کو سر سے نکالو۔ یہ جنوں تمھیں نہیں پنپنے دے گا
کبھی اِن باتوں پر بھی غور کیا کرو۔ کہ مثلاً تمھارے اِسی شہر میں کتنے
آدمی ہیں۔ اور اُن میں کتنے ہیں۔ جو نوکری سے معاش پیدا کیا کرتے ہیں۔
حساب لگاؤ گے۔ تو فیصد کوئی چوتھے پانچویں درجہ کا ڈیسمل نکلے گا۔ پھر
مردم آزاری کے مواقع پاکر شیخی بگھارنے کی تو بات اور ہے۔ خوشحالی کا ایک
سٹنڈرڈ قرار دے لو۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں۔ کہ جس کی سَو روپیہ ماہوار
کی آمدنی ہو اُس کو اِس زمانہ میں خوشحال سمجھنا چاہیئے۔ اب دیکھو کہ
خوشحالی کے اسٹنڈرڈ کے لحاظ سے نوکری پیشوں میں فی صد کتنے ہیں اور
دوسرے پیشوں میں کتنے تو پاؤ گے۔ کہ اِس نسبت میں نوکر پیشہ۔ چوتھے
پانچویں درجہ کے ڈیسمل سے بھی دور ہٹے ہوئے ہیں۔ پس تم انگریزی پڑھکر
جو ایک نوکری پر دھتا دو۔ تو اُس کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ اِس عمارت
کو جو برسوں کی محنت سے بنائی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے ڈھاتے ہو۔ عقلاً
شرعاً کوئی سا پیشہ بھی مُبتذل نہیں۔ مُبتذل اگر ہے۔ تو وہ آدمی ہے۔ جو
دغا بازی بے ایمانی سے پیشے کو بدنام کرتا ہے دل پر دینداری اور نیکی کا
پرتو پڑا ہو تو جانو۔ کہ اصلی عزت کیا ہے؟ "خدا کے نزدیک بڑا بزرگ
وہ ہے۔ جو بڑا پرہیزگار ہو۔" لوگ نہ اِس لیئے نوکری کے گرویدہ ہو رہے
ہیں۔ کہ اس پیشے میں تموّل اور خوشحالی زیادہ ہے۔ نہیں۔ بلکہ اِس لیئے۔
کہ ان کو اپنے ابنائے جنس پر حکم چلانے اور اُن کو ستانے۔ اور ایذا دینے
کا موقع ملتا ہے۔ لوگوں نے اِسی کو عزت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ نیک دل

اور دیندار آدمی کی نظر میں اس سے بڑھکر کوئی بے عزتی کی بات نہیں۔ تم تو نصیحت کی بات کو اس کان سنتے اور اس کان نکال دیتے ہو۔ تحکم اور مردم آزاری کو عزت سمجھو۔ تو نوکری ذریعۂ عزت ہے۔ اور پبلک تابعداری کے اعتبار سے دیکھو۔ تو وہ ایک طرح کی غلامی ہے۔ کتنی ہی بڑی نوکری کیوں نہو۔ آخر کسی نہ کسی کی محکومی تو اس میں ہو ہی گی۔ غرض نوکری کو عموماً پیشۂ معزز سمجھنا محض خیالی بات ہے۔ عزت اور ذلت کسی پیشہ پر موقوف نہیں۔ بلکہ عزت اور ذلت کا مدار انسان کا اپنا کردار ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بڑی خدمت پر مامور ہے۔ اور وہ آمدنی بھی معقول رکھتا ہے اور بڑی شان سے زندگی بسر کرتا ہے۔ حکومت بھی ہے۔ اختیارات بھی ہیں۔ اور سرکار میں رشد و رسائی ہے۔ اور وہ ناحق بندگان خدا کو ایذا دیتا۔ اور ان کے حقوق تلف کرتا۔ اور رشوت لیتا ہے۔ حقیقت میں وہ سب سے زیادہ ذلیل ہے۔ نہ صرف پبلک کی نظر میں۔ بلکہ خود اپنی نظر میں اور خدا کے نزدیک۔ لیکن ایک غریب آدمی جو محنت مزدوری سے جائز طور پر معاش پیدا کرتا۔ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ کوئی اس کا شاکی نہیں۔ ایسا شخص اصلی عزت رکھتا۔ اور اس کا مستحق ہے۔

اس وقت جو اس تعمیم کے ساتھ تعلیم ہو رہی ہے۔ اور تعلیم کو اس سے بھی زیادہ عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اچھی طرح طالب علموں کے ذہن نشین کر دینا چاہیئے کہ نوکری کے خبط کو سر میں نہ آنے دیں۔ ورنہ تعلیم سے فائدے کی جگہ الٹا نقصان اٹھائیں گے۔ اور ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی۔ اور نہ صرف اپنی زندگی۔ بلکہ اور بہت سی زندگیاں جو ان کے ساتھ وابستہ ہیں سب کو تلخ کر دیں گے۔ میرے

اِس بیان سے کوئی صاحب ایسا نہ سمجھیں۔ کہ میں تعلیم کی طرف سے لوگوں
کے دلوں کو اُچاٹ کرتا ہوں۔ میرا مقصود ہرگز یہ نہیں میں تو تعلیم کو
اور اِسی تعلیم کو جو اِن دنوں ہو رہی ہے۔ ہر فرد بشر کے لیئے نہایت
ضروری خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھکو وہ دن آتا ہوا دکھائی دے رہا
ہے۔ (اگرچہ جب تک وہ آئے آئے۔ میں دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا۔)
مگر مجھکو وہ دن آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ جب کہ یہی تعلیم شرطِ زندگی
ہونے والی ہے۔ اور زندگی سے میری مراد ہے۔ معزز اور مطمئن زندگی
میرا مطلب صرف اِس قدر ہے۔ کہ جو لوگ تعلیم پا رہے ہیں۔ اور تعلیم
تو سبھی کو پانی چاہیئے۔ غرض سارے تعلیم یافتہ اگر ایک ہی پیشے پر جُھک
پڑیں گے۔ گو وہ پیشہ فی حدِّ ذاتہٖ کیسا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ یہ اُس کا
ضروری اور بدیہی نتیجہ ہے۔ کہ سب بھوکوں مریں۔ لوگوں کی ضرورتیں
متنوع ہیں۔ اور اِس سے دُنیا میں متنوع پیشے چل پڑیں ہیں۔ انسانی
ضرورتوں اور پیشوں کے تنوّع سے ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا میں روزی کی
کمی نہیں۔ مگر ہم ایک پیشۂ خاص سے مقیّد ہو کر روزی کو تنگ کر لیتے
ہیں۔ اب یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ نوکری کے علاوہ دوسرے پیشوں
کے لیئے تعلیم ہی کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے۔ کہ تعلیم سے تو کبھی کوئی
ادنیٰ پیشہ بھی بے نیاز نہیں ہوا۔ ہاں تعلیم سینہ بسینہ ہوتی رہی ہے۔
یا نقل و تقلید سے۔ اِس زمانے میں یہ نئی بات پیدا ہوئی ہے۔ کہ ایک
ایک چیز اور ایک ایک کام علم مستقل قرار پایا ہے۔ مثلاً موسیقی۔ کہ
ہمارے یہاں سینہ بسینہ اُس کی تعلیم ہوتی ہے۔ یا نقل و تقلید سے لوگ
اُس کو حاصل کرتے ہیں۔ مگر تم نے انگریزی بینڈ بجتے دیکھے ہوں گے۔

کہ اونچی اونچی میزوں کا ایک حلقہ ہے۔ لوگ مزامیر لئے اس کے گرد کھڑے ہیں۔ ہر ایک کے آگے ایک کتاب دھری ہے۔ صدر مقام پر بینڈ ماسٹر کھڑا ہوا باجے بجوا رہا ہے۔ انگریزوں کی ولایت میں تو یہ حال ہو گیا ہے کہ درزی اور حجام اور موچی اور لوہار تک اپنا پیشہ نہیں چلا سکتا۔ تا وقتیکہ اس نے سبقاً سبقاً اپنے پیشے کی کتابی تعلیم نہ پائی ہو۔ اور یہ بات سب پر روشن ہے۔ کہ یہ ہندوستان کل باتوں میں یورپ کی تقلید کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور تقلید کے بغیر اس کو چارہ نہیں۔ یہ تعلیم گو کسی خاص پیشے کی نہ بھی ہو۔ تاہم اس سے اتنی آگاہی تو انسان کو ضرور ہو جاتی ہے۔ کہ وہ جس کام کو اختیار کرے گا۔ اس کو کر دکھائے گا۔ اور سلیقہ کے ساتھ کر دکھائے گا۔

پنڈت رتن ناتھ در سرشار

لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۴ برس کے تھے جب ان کے والد پنڈت بیجناتھ صاحب کا انتقال ہوا آپ عربی۔ فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے ۱۸۷۸ء میں آپ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے۔ وہاں سے علیحدگی کے بعد اپنا ایک خاص رسالہ خمکدہ سرشار نکالنے لگے۔ ۱۸۹۰ء میں آپ حیدر آباد گئے۔ ہز اکسلینسی مہاراجہ کشن پرشاد صاحب اس زمانے میں وزیر افواج تھے۔ سرشار وہیں رہتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں حیدر آباد ہی میں آپ راہی ملک بقا ہوئے۔

آپ فسانہ نگاری کے طرز جدید کے موجد ہیں۔ آپ کی تصانیف سے سیر کہسار۔ جام سرشار۔ فسانہ آزاد مشہور ہیں۔ ان سب

ہیں بہتر تصنیف فسانۂ آزاد ہے۔ اس میں جس واقعہ منظر مناظر قدرت کو دکھایا ہے۔ اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ واعظ۔ افیونی۔ بھٹیاری۔ جس کی زبان لکھی ہے۔ پورا خاکہ اتار لیا ہے۔ مستورات کی زبان ایسی صحیح طور سے ادا کی ہے۔ گویا بیگمات ہی کی زبان ہے فسانۂ آزاد لکھنؤ کے اس وقت کی سوسائٹی کا دلچسپ مرقع ہے۔

لکھنؤ کا محرّم الحرام

سینوں میں جگر پہ تیر غم چلتے ہیں رخساروں پہ اشک شمع ساں ڈھلتے ہیں
کیوں تعزیہ خانوں میں نہ رونق ہو زیاد دل بھی تو چراغوں کی طرح جلتے ہیں

میاں آزاد سیلانی آدمی سیر سپاٹے پر ادھار کھائے ہوئے سر گشتگی کی دھن جو سمائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے۔ اور سوچے۔ کہ چل کے محرّم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر شیون و شین۔ گھر گھر بکا و بین۔ گریہ وزاری۔ اشکباری۔ جم غفیر۔ مجمع کثیر۔ ایک چلے تن بول اٹھے:: اور کیوں نہ ہو؟ مجالس عزا کی دھوم دھام ہے لکھنؤ کا محرّم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوز خوانی۔ لکھنؤ کی خوش بیانی۔ لکھنؤ کی عزاداری۔ لکھنؤ کی سوگواری۔ از شام تا روم مشہور ہر مرز و بوم ہے تعزیہ خانوں میں دھوم۔ امام باڑوں میں ہجوم ہے۔ اور ان سب میں حسین آباد مبارک کا البدر فی النجوم ہے:: ان کے ساتھ ان کے ایک دوست ہولئے تھے۔ ان کی بیقراری کا حال کچھ نہ پوچھئے۔ وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے۔ ٹوٹے جاتے ہیں۔ کہ شہید کربلا کا واسطہ آل مصطفٰے کا صدقہ ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو۔ مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شخص نے

ایک آہ سرد کھینچکر کہا "میاں - اب وہ لکھنؤ کہاں؟ وہ لوگ کہاں - وہ دل کہاں؟ - لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جانِ عالم کے وقت میں دیکھتا تو ارنی گوے اوج طور بھی عش عش کر جاتا - بانکوں کی شمشیر دو پیکر جب دیکھو - میاں سے دو انگل باہر - کسی نے ذرا تیکھی چتون کی - اور انھوں نے کھٹ سے سروہی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا - بھنڈارا کھل گیا - ایک ایک گھنٹے میں ہنبل ہنبل خانہ جنگیوں کی خبر آتی تھی - دکاندار جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر سٹک جاتے تھے - وہ دھکم دھکا - وہ بھڑ بھڑکا ہوتا تھا - کہ واہ جی واہ! - انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا - اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا - ادنٰی ادنٰی آدمی ہزاروں لٹاتا تھا - اب کوئی بھی نذر حسین نہیں نکالتا اب انیس ہیں نہ دبیر مونس ہیں - نہ مشیر ضمیر ہیں نہ دلگیر - ؎

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے — اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں — وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

دبیر مرحوم کی تربت کو خدا عنبریں کرے - واللہ خداے سخن تھا - سرمنبر ع - جب قفل دہن کھلا، جواہر نکلے ؛ گویا کہ زبان کلید گنجینہ ہے - ایک ہی رباعی پڑھی - اور سامعین چار موجۂ حیرت میں غرق ہو گئے - کہ اللہ اللہ یہ فصاحت - یہ بلاغت ؎

دکھاتے امیر ابن امیر آتا ہے — دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاق سخن خلق چلی آتی ہے — لو مرثیہ پڑھنے کو دبیر آتا ہے

اور انیس مرحوم کو خدا بخشے - باللہ العظیم - کلام کیا - جواہرات کے ٹکڑے - قند و نبات کے ریزے - نور کے مرثیے ہیں ع - گر جوہر شناس ہے تو انھیں موتیوں میں تول ۔ فصحاے خطۂ پاک ایران کہتے ہیں - کہ کہا

انیس ؟ کجا فردوسی ؟ کجا کمر بند مرصع ؟ کجا شال طوسی ؟ بزم میں وہ ڈھنگ - رزم میں وہ رنگ - کہ ؎

مضمونِ انیس کا نہ چربا اُترا | اُترا بھی تو کچھ بگڑ کے نقشا اُترا
نقاش نے سو طرح کی محنت کھینچی | تصویر نہ کھینچ سکی تو چہرا اُترا

" لیکن ہاتھی لٹا بھی - تو کہاں تک - اب بھی اِس شہر کی سی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی - آپ کہئے کہاں کی سیڑھیاں ہیں - نجف اشرف - کربلا - کاظمین - میر باقر کے امام باڑے - چوپٹیاں جہاں چلو داخلِ حسنات ہوں - واللہ - بہشت کی یہی سیدھی راہ ہے " ؎

دربارِ جناب مصطفےٰ کو دیکھا | اِن آنکھوں سے شانِ کبریا کو دیکھا
فردوس میں پہونچے تو نجف میں پہونچے | جنت دیکھا جو کربلا کو دیکھا

رنگ رلیاں مناتے پیدل چلے جاتے تھے - راہ میں وہ بھیڑ - وہ ریل پیل - کہ عیاذاً باللہ - شانے سے شانہ چھلتا تھا - ہوا جب بعد خرابی بسیار کہیں گذر پائے - تو ضیق النفس ہو جائے - بانکے ترچھے - تیکھے ثقات - مقدس کس و ناکس غریب و امیر - برناو پیر - اُمڈے چلے آتے ہیں - جدھر دیکھو نرالی دھج - مومن پاک - مثل کعبہ سیاہ پوش - کوئی ماتم حسین میں سر برہنہ چلا جاتا ہے - کوئی حلہ پوشانِ بہشت کی طرح ہرا ہرا جوڑا پھڑکاتا ہے -

یہ لیجئے ! - آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل - آہو ہو ہو ! خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے - واہ میاں باقر ! - کیوں نہ ہو - نام کر گئے چکا چوندھ کا عالم ہے - لیکن گلی تنگ - تماشائیوں کی عقل دنگ -

ع جائے تنگ است مردماں بسیار ؛ مگر خلقت گھس پیٹھکر دیکھ ہی

آتی ہے۔ ناک ٹوٹے۔ یا سر پھوٹے۔ آغا باقر کا امام باڑہ ضرور دیکھیں گے وہاں سے جو طرارہ بھرا۔ تو کچے پل پہونچے۔ دیکھتے کیا ہیں۔ کہ ایک پیر فرتوت دقیانوس کے ہمعصر بیٹھے اگلے لوگوں کو رو رہے ہیں۔ واللہ لکھنؤ کے کمہار بڑے نادرہ کار ہیں۔ ایسا بڈھا بنایا۔ کہ معلوم ہوتا ہے پوپلے منھ سے اب بولا۔ اور اب بولا۔ وہی سن کے سے بال! وہی سفید بھوویں!۔ وہی چتون! وہی پیشانی کی شکن!۔ وہی ہاتھوں کی جھریاں وہی کمر خم! وہی سینہ جھکا ہوا!۔ واہ رے کاریگر!۔ تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے!۔ اور تیرا بوڑھا تو اللہ ہی اللہ۔

وہاں سے جو چلے۔ تو داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم کے امام باڑے میں آئے۔ یہاں سورج مکھی پر وہ جوبن تھا۔ کہ آفتاب اگر ایک نظر چھپ چھپا کر وہ نور دیکھ پاتا۔ تو مارے غیرت کے بحر طلسمات میں غوطے کھاتا۔ بے تکلف کرسیوں پر جا ڈٹے۔ اہلکاران سلیقہ شعار نے چکنی ڈلی۔ الائچی پیشکش کی۔ وہاں سے حسین آباد مبارک میں پہونچے۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! یہ امام باڑہ ہے۔ یا روضۂ رضوان! الٰہی!۔ یہ مکاں ہے۔ یا باغ جناں؟ ہر در و دیوار سے محمد علی شاہ۔ فردوس آرامگاہ کا نام روشن ہے۔ امام باڑہ سجا سجایا دلہن کا ایسا جوبن ہے۔ برجوں پر ضیائے موفور۔ تو منار نور علیٰ نور۔ حیرت تھی۔ کہ یہ کوہ نور ہے۔ یا شعلۂ طور ہے۔ سرخ قندیل پر یاقوت احمر ہیرا کھائے چراغاں کی قطار پر مہتاب پروانہ ہو جائے۔ پھر نہر مصفا جو نظر آئی تو آنکھوں نے عجب طراوت پائی۔

بسنت کی بہار

اللہ اللہ! کیا روح افزا بہار ہے! جس طرف دیکھیے زعفران زار ہے۔ صوفیِ صافی تک مریدِ مغبچۂ بادہ فروش ہے۔ بہارِ بسنت کا وہ جوش ہے۔ کہ ساقی تک مدہوش ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ ؎

حکمرانی پہ ہوا ہے دلِ سلیمان بہار عشق پیچاں بن گیا طغرائے فرمانِ بہار
زلفِ سنبل کو سمجھیے گوشِ گل کو جانیے نرگسِ شہلا کو کہیے چشمِ فتانِ بہار

بہارِ باغ کا عالم خطِ گلزار میں مسطور ہے۔ صفحۂ قرطاس نورٌ علیٰ نور ہے۔ گلزار و بستان ہیں۔ کہ جنت کے چمن۔ حور و غلماں ہیں۔ یا نسرین و نسترن۔ فردوسی آئے۔ تو گلچیں ہو جائے۔ رضواں دیکھے۔ تو شرمائے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی کھٹ پٹ۔ بادِ بہاری کے جھونکے سنسناہٹ سبزہ کی لہک گلِ جعفری کی مہک۔ کلیوں کا چٹکنا۔ پھولوں کا مہکنا شاخِ گل کی کج ادائی۔ سنبل کی آشفتگی۔ گلوں کی رعنائی۔ دزدیدہ نگاہوں سے نرگسِ شہلا کی نظارہ بازی۔ زبانِ خاموش سوسن کی زبان درازی۔ شاخِ گل کا مستانہ وار جھومنا۔ اشجارِ پرمیوہ کا زمین کو بار بار چومنا۔ سنبل کی سرمستی۔ نرگس کی جام پرستی۔ نونہالانِ چمن کے ہاتھوں میں پھول کے جام۔ جیسے رندانِ مے آشام۔ منقارِ بلبل نغمہ خیز ہے۔ موسیقار ترانہ ریز۔ طوطی کی خوش بیانی۔ عنادل کی غزل خوانی۔ کوئل کی کوکو۔ قمری کا نعرۂ حق سرہ۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! ؎

بہار آئی ہے عالم ہے گل و نسرین و سوسن کا جوانانِ چمن نازاں ہیں اپنے اپنے جوبن پر
عنادل جوشِ مسرت سے بے پر کی اڑاتے ہیں۔ غنچۂ گل سن سن کر

زیرِ لب مسکراتے ہیں۔ شبنم کے قطرے ہرے ہرے پتوں پر اس طرح نمودار ہیں۔ جیسے کسی سبز پوش گلگوں کے ہاتھ میں لآلیِ آبدار ہیں۔ درخت پھولے پھلے۔ سروِ سہی سانچے میں ڈھلے۔ نسرین و نسترن کا حسن بے عیب و داغ۔ نرگس و گُل چمنستان کے چشم و چراغ۔

وہ بہار آئی ہوئے نغمہ سرا مرغِ چمن — غیرتِ باغِ ارم آج ہے صحنِ گلشن
جوش ہے زمزمہ سنجی پہ ہیں مرغانِ بہار — کیا تعجب ہے جو گویا ہو زبانِ سوسن
کرم ابرِ بہاری سے ہے سیراب زمین — خاک اُڑ کر نہیں ہوتی ہے غبارِ دامن
نئے مضمون ادا کرتی ہے ریزے کی زباں — کھولتا نکتۂ سربستہ ہے غنچہ کا دہن
آبِ شبنم سے کہاں کاسۂ گُل ہیں لبریز — جل ترنگ آج بجانے کو ہے معشوقِ چمن
آبشاروں کا سرِ آئینہ بجاتی ہے صبا — تال دیتا ہے کفِ برگ سے ہر نخلِ چمن
کوئی افسانۂ زہّاد نہیں سنتا ہے — خس و خاشاک سے کیا صاف ہے صحنِ گلشن
ایسی کثرت سے جو ہو بارشِ بارانِ بہار — زاہدِ خشک کا ممکن ہے نہ ہو تر دامن

پھولوں سے لبریز گلچینوں کی جھولی ہے۔ باغبان کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے۔ حوضِ باغ آئینہ کی صورت صاف۔ پانی مثلِ بلّور شفاف روشیں صاف و پاک۔ پٹریاں بے خس و خاشاک۔ رنگیلے جوان نشاطِ گلگشت میں مخمور۔ بادۂ مسرت سے چُور۔ لکھنؤ میں ہر گلی کوچہ زعفران زار ہے۔ کیوں نہ ہو؟ آخر بسنت کی بہار ہے۔ یوں تو ہر سمت طبلے پر تھاپ۔ سارنگی کی چھیڑ چھاڑ اور نغمہ سرائی کا انتظام ہے۔ مگر شاہ مینا صاحب کی درگاہ سب میں انتخاب۔ زیارتگاہِ خاص و عام ہے۔ اللہ اکبر! گردِ مزار کہیں نوجوانوں کی وہ دھوم دھام ہے۔ کہ جس طرف دیکھئے اژدحامِ عام ہے۔ غٹ کے غٹ جوق جوق چلے جاتے ہیں

غول کے غول اُمڈے آتے ہیں۔ وہ بھیڑ بھڑکّا۔ وہ دھکّم دھکّا۔ وہ ریل پیل۔ وہ شور و شر کہ الاماں!۔ الحذر!۔ ایک دوسرے کو ریلتا ہے۔ دوسرا تیسرے کو ڈھکیلتا ہے۔ کہیں قوّال حقّانی غزلیں گاتے۔ صوفیوں کو وجد میں لاتے ہیں۔ کسی اہل دل کو حال آیا۔ کوئی آنسو بھر لایا۔ ہو حق کا نعرہ بلند ہے۔ سرود و غنا کا لطف دو چند ہے۔ فقط

برات کی دھوم

ایک رئیس گردوں مدار و امیر باوقار کی ایک دختر فرخندہ اختر تھی۔ رئیس موصوف نے اُس کو بناز و نعم پالا۔ جب لڑکی کچھ سیانی ہوئی تو اُس کی شادی کی فکر پیدا ہوئی۔ بڑے بڑے نام برآوردہ رؤسائے ذوی الاقتدار کے ہاں سے پیغام آنے لگے۔ دُور دُور تک اُس کے حسن و جمال کی شہرت ہوئی۔ آخرکار ایک رئیس ذالاتبار۔ جم اقتدار کے ساتھ نسبت قرار پائی۔ پھر کیا تھا۔ طرفین سے تیاریاں ہونے لگیں۔ اب شوق کی اس درجہ افزائش ہے۔ کہ جی چاہتا ہے۔ سب جمع جتھا لٹا دیں۔ آنکھ بند کرکے خرچنے لگیں۔ ایک نے اسی ہزار روپیہ قرض لئے۔ دوسرے نے تعلقے کے کوڑے کئے۔ دونوں لنگوٹی پر پھاگ کھیلنے لگے۔ جوڑے بٹے خدمتگاروں۔ ماماؤں۔ اصیلوں۔ نوکروں۔ چاکروں نے بیش بہا جوڑے پھڑکائے۔ خوب انعام و خلعت پائے۔ برات کے دن بڑے کرّ و فر سے برات سجی گئی۔ دونوں طرف خوب ٹھاٹھ تھے۔ ؎

الماس کے واں تھے جھاڑ فانوس　　یاں جلوہ فروز تخت طاؤس

مہتاب سے چاندنی کا واں فرش　　یاں چرخی سے چھچے ہیں سرِ عرش

گلگوں تھا کسی کا باد رفتار　　گل رنگ کسی کا تھا ہوا دار
ہاتھی تھے تو مستیوں کی دھن تھی　　گھوڑے تھے تو چابکی کی لت تھی

وہ ماہ کہ تھا سوار شبدیز　　تھا پا بہ رکاب شوقِ مہمیز

سب سے پہلے نشان کا ہاتھی۔ شب رنگ مست۔ صورت دیکھے انسان ڈر جائے۔ اس کے بعد بڑی دور تک جلوس کی بہار۔ اور سانڈنیوں کی قطار تھی۔ عربی۔ ترکی۔ تازی۔ ویلا۔ کیپ۔ انواع و اقسام کے رہوار باد رفتار۔ خوشخرام۔ و تیز لگام ساز دار۔ سجے سجائے۔ پرے کے پرے جمائے۔ چاندی کا گہنا پہنے۔ دُلہن کی صورت بنائے۔ چھم چھم کرتے چلتے جاتے ہیں۔ آرائش کے تخت بڑے صنّاعانِ چابک دست کے بنائے ہوئے لطف جلوس دوبالا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ گلزارِ ارم کے پھول پھولے ہیں۔ سرو بنایا۔ تو نقل کو اصل کر دکھایا۔ چانڈو بازوں کا تخت قابل دید تھا۔ کوئی نشے میں جھوم رہا ہے۔ کوئی نے کو چوم رہا ہے۔ کوئی گرمٹ تھامے غلیں ہے۔ کوئی کنارا ٹوستا ہے۔ بعینہ چانڈو خانے کی تصویر کھینچ دی۔ جزیرے کا تیلی کا تخت۔ رہس منڈل دیکھنے سے دل کو سرور حاصل ہوتا تھا۔ سواروں کا تخت ستم ڈھاتا تھا۔ سوار خاکی وردیاں پہنے کرچ لٹکائے۔ گھوڑے کی باگ اٹھائے۔ دھاوا بولا ہی چاہتے ہیں۔ قدم قدم پر آتشبازی چھوٹ رہی ہے۔ انار آسمان کی خبر لاتے ہیں۔ پھلجھڑی کی تعریف میں اچھے اچھے آتش زبانوں کی زبان لال ہے۔ چرخی کا چکر دیکھکر عقل چرخ تھی۔ کامل فن آتش بازوں نے بڑی دلسوزی سے آتش بازی بنائی تھی۔ انار سے تختۂ زمرّدیں نظر آتا تھا۔ باجے والوں کی جماعت ڈہل کی دھوم۔ تماشائیوں کا ہجوم

گوروں کی لال لال وردیوں سے گُل لالہ کھلا تھا۔ تلنگوں کی کالی کالی کُرتیوں سے حاسدوں کا مُنہ کالا تھا۔ ایک سمت سے چوبدار عصائے نقرئی لئے پگڑیاں جمائے گھوم رہے تھے۔ دوسری سمت خاص بردار رنگین جھنڈیاں اُٹھائے پھرتے تھے۔ رئیس۔ شریف۔ عمائد۔ لاتعد و غیر محدود تھے۔ جملہ سامان لطف و مذاق موجود تھے۔ نوشہ حسین و مہ جبیں خلعت بیش بہا زیب تن کئے بصد طنطنہ و دبدبہ گلگون خوش عنان پر سوار تھا۔ گھوڑا ایسا شائستہ کہ دودھ پیتا بچہ تک سوار ہوجائے۔ پاؤں کی مہندی نے دُلھن بنا دیا تھا۔

نوشہ کے گھوڑے کے بعد کئی ہاتھی تھے۔ مکنا۔ اور ایک دنتا اور دُم کٹا اور پاٹھا۔ اُن پر دس دس بارہ بارہ۔ چودہ چودہ برس کے لڑکے سوار تھے۔ الغرض خوب چکر کھا کر اور شوقوں کو جگا کر برات دُلھن کے مکان سے تھوڑی ہی دُور پر تھی۔ کہ آتش بازی سے ایک ہاتھی بھڑکا۔ دوسرے نے اُس کا ساتھ دیا۔ فیلبان لاکھ تدبیریں کرتا ہے آنکس لگاتا ہے۔ مگر وہ بری و دحشت ییل ایک نہیں سُنتے۔ تیسرا ہاتھی لپکا۔ تو ایک بُڑھیا کچل گئی۔ ایک پٹشاخہ والا پس گیا۔ دس دُکانیں تہ و بالا ہوگئیں۔ گھبراہٹ اور بدحواسی سے پندرہ بیس آدمی زخمی ہوئے۔ اتنے میں آرائش لُٹنے لگی۔ ہُلّڑ ہوگیا۔ برقندازوں کی ایک نہیں چلتی۔ آدھے تختت لُٹ گئے۔ چھ ٹوپیاں اُتر گئیں۔ تین لڑکوں کا زیور اُچکوں نے ہتھیا لیا۔ ایک کا کان کٹ گیا۔ چلو ناک تو بچی۔ مبارک باد ہے خدا خدا کرکے دُلھن کے مکان پر برات پہونچی ؁

درتک جو برات اِدھر سے آئی کی سب نے اُدھر سے پیشوائی

بارانِ گلاب بارشِ گل ہو کر بڑھے آگے با تجمل
ڈلیاں پئے مشک بو دھواں دھا بیڑے چکنے پان کے مزیدار
جب عقد کی آن کے ساعت آئی دو رشتوں میں اک گرہ لگائی

یہاں آزاد گھنٹوں یہ کیفیت چپکے چپکے دیکھا کئے۔ اور یہ سوچنے لگے۔ کہ اس قدر زرِ کثیر بے وجہ بلا سبب مفت بیکار ضائع ہوا۔ اور ہزاروں روپیہ غارت گئے۔ اگر یہی زر خطر امور رفاہِ عام اور فائدہ انام میں صرف ہوتا۔ تو سبحان اللہ! افسوس! صد افسوس! کہ ہندی اس آرائش پر لٹو ہیں۔ ہم نے کہیں سنا نہیں کہ اس فضول دھوم دھام سے کسی ملک کو فائدہ پہونچا ہو۔

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے بھاگو بھاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
جاگو جاگو یہ خوابِ غفلت کیسا دیکھو دیکھو اجل کمین گاہ میں ہے

ایسی باتیں۔ یہ دھوم۔ یہ رسوم مذموم۔ درد انگیز۔ حسرت خیز ہیں۔ مگر اہل ہند ان ہی کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ یہ اسی کو بڑا عروج سمجھتے ہیں۔ کہ تمام عمر کی آمدنی ایک برات کی نذر کردیں۔ دو گھڑی کی واہ وا۔ اس کے بعد حال تباہ۔ عیاذاً باللہ! شادی کو غم سے مبدل کرنا کون دانائی ہے۔ لیکن حیف! صد حیف! کہ ہم ان امور پر نظر نہیں ڈالتے

شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی

پیدائش پانی پت سنہ ۱۸۳۷ء وفات پانی پت سنہ ۱۹۱۴ء

آپ پانی پت ضلع کرنال کے ایک معزز خاندان سے ہیں۔ آپ کے بزرگ ہرات سے آئے اور پانی پت اور اس کے ملحقات مدد معاش کے طور پر

شاہی انعام میں ان کو ملے۔ سنہ ۱۸۳۷ء کے قریب آپ وہیں پیدا ہوئے۔ میر ممنون دہلوی کے بھتیجے۔ سیّد جعفر علی سے آپ نے فارسی پڑھی۔ جو اس زمانہ کے اعلیٰ فارسی دانوں میں تھے۔ اور حاجی محمد ابراہیم حسین انصاری سے عربی کی تعلیم پائی۔ ۱۷ سال کی عمر سے آپ اکثر دہلی میں رہے۔ منطق فلسفہ وغیرہ کی وہیں تکمیل کی۔ عنفوان شباب ہی میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کی تعلیم آپ کے سپرد ہوئی۔ اس زمانے میں جو کچھ کہا۔ نواب صاحب سے اس میں اصلاح لی۔ اس تعلق سے آپ کو آزردہ - نیر - رخشاں - غالب کی خدمات میں باریابی کے اکثر موقعے ملتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ غالب مرحوم کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے غالب نے آپ کی طبیعت کا اندازہ کرکے کہا۔ کہ "اگر تم شعر نہ کہوگے تو ظلم کروگے"۔ مرزا غالب کی وفات پر آپ نے اور مرزا قربان علی بیگ سالک اور میر مہدی حسین مجروح نے مرثیے لکھے۔ مگر جو مقبولیت آپ کے مرثیے کو حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

ابتدا میں آپ کی شاعری کا بھی وہی ایشیائی شاعری کا رنگ تھا۔ سنہ ۱۸۷۴ء کے بعد جب آپ کو پنجاب بک ڈپو لاہور میں کتابوں کی عبارت زمانہ حال کے مطابق درست کرنے کی خدمت ملی۔ اس وقت مغربی لٹریچر پر غور کرنے کا آپ کو بہت اچھا موقع ملا۔ اسی وقت اس راستہ کو یک قلم ترک کرکے طرز جدید اختیار کیا۔ کرنل ہالرائڈ صاحب نے لاہور میں ایک مجلس مشاعرہ قایم کی تھی۔ اس میں بجائے مصرع طرح کے خاص عنوان پر شعرا کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا۔ مولانا نے بھی اس گلشن میں جدّت طرازی کے نغمے سنائے چنانچہ نشاط امید۔ مناظرۂ رحم و انصاف۔ حب وطن۔ برکھا رت وغیرہ اسی بزم کی یادگار ہیں۔

بُک ڈپو سے تعلق کے ۴ سال بعد آپ اینگلو عربک اسکول دہلی کے مدرس ہوئے۔ اسی زمانہ میں سر آسمان جاہ کالج کے دیکھنے کے لئے علی گڈھ آئے۔ مولانا بھی موجود تھے۔ اُن کی باریابی ہوئی اور ۷۵ روپیہ ماہوار علمی وظیفہ مقرر ہوگیا۔ ۱۸۹۰ء میں جب آپ علی گڈھ ڈپوٹیشن کے ساتھ حیدر آباد گئے۔ اس وقت نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام تھے۔ وہاں آپ نے کئی نظمیں پڑھیں۔ اُس وقت وظیفہ میں اضافہ ہوکر سَو روپیہ ماہوار ملنے لگے۔ اس کے بعد ہی آپ بار ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

مولانا اپنے طرز کے موجد اور نیچرل اور قومی شاعری کے مجدّد۔ اور ہندوستان کے معجز بیان سعدی ہیں۔ آپ کا کلام صاف دلاویز۔ قومی اصلاح سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کی نثر کی خصوصیات یہ ہیں۔ کہ الفاظ اور معنی کی خوبیوں کو برابر لحاظ رکھا ہے۔ کلام میں کہیں اہمال و اشکال نہیں۔ لفظ البتہ بعض جگہ مشکل ہیں۔ سلاست سر سیّد کے کلام میں بہت زیادہ ہے۔ با محاورہ اور دلچسپ عبارت لکھنے میں پروفیسر آزاد یقینی بالا ہیں۔ مگر فلسفیانہ اور مورخانہ نظر اور لٹریچر کے رموز پر جس قدر واقفیت مولانا حالی کو تھی سر سیّد مرحوم وہاں تک نہیں پہونچے۔

نثر میں حیات سعدی۔ یادگار غالب۔ حیات جاوید۔ مقدمہ شعر و شاعری اور نظم میں مسدّس مدو جزر اسلام۔ دیوانِ حالی شکوہ ہند اور بہت سی مثنویاں آپ کی یادگار ہیں۔

۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ عالیہ نے مولانا کو شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جو اُن کی علمی خدمات کے اعتبار سے ہر طرح زیبا و مناسب تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہکر اس دار فانی سے چل بسے۔ قومی اور

نیچرل شاعری کا آفتاب غروب ہوگیا۔

محاورہ اور روزمرّہ

محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ بات چیت اہلِ زبان کے روزمرّہ کے موافق ہو۔ خواہ مخالف۔ لیکن اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روزمرّہ بول چال یا اسلوبِ بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرّہ یا اسلوبِ بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے۔ کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو بمنزلہ مفرد کے ہیں۔ کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں۔ جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا بلکہ دونوں کو ملاکر جب پانسات بولیں گے۔ تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضرور ہے۔ کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے۔ قیاسی نہ ہو بلکہ معلوم ہو۔ کہ اہلِ زبان اس کو اِس طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پانسات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کرکے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا۔ تو اُس کو محاورہ نہیں کہنے کے۔ کیونکہ اہلِ زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے۔ یا مثلاً بلا ناغہ پر قیاس کرکے اُس کی جگہ بے ناغہ۔ ہر روز کی جگہ ہر دن۔ روز روز کی جگہ دن دن۔ یا آئے دن کی جگہ آئے روز بولنا۔ ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ الفاظ اس طرح اہلِ زبان کے بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورہ کا اطلاق خاصکر اُن افعال پر کیا جاتا ہے۔ جو کسی اسم

کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں۔ بلکہ مجازی معنوں میں استعمال
ہوتے ہیں۔ جیسے اُتارنا۔ اُس کے حقیقی معنی کسی جسم کو اوپر سے نیچے لانے کے
ہیں۔ مثلاً گھوڑے سے سوار کو اُتارنا۔ کھونٹی سے کپڑا اُتارنا۔ کوٹھے پر سے
پلنگ اُتارنا۔ لیکن اُن میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دوسرے معنی صادق نہیں
آتے۔ کیونکہ اِن سب مثالوں میں اُتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا
ہے۔ ہاں نقشہ اُتارنا۔ نقل اُتارنا۔ دل سے اُتارنا۔ ہاتھ اُتارنا۔ پہنچا
اُتارنا۔ یہ سب محاورے کہلائیں گے۔ کیونکہ اِن سب مثالوں میں اُتارنے
کا اطلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے۔ یا مثلاً کھانا۔ اِس کے حقیقی معنی
کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اُتارنے کے ہیں۔ مثلاً
روٹی کھانا۔ دوا کھانا۔ افیم کھانا۔ وغیرہ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے
معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ سب مثالوں میں کھانا
اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا۔ قسم کھانا۔ دھوکا
کھانا۔ پچھاڑیں کھانا۔ ٹھوکر کھانا۔ یہ سب محاورہ کہلائیں گے۔

محاورہ کے جو معنی ہم نے اوّل بیان کئے ہیں۔ وہ عام یعنی دوسرے
معنوں کو بھی شامل ہیں۔ لیکن دوسرے معنی پہلے معنی سے خاص ہیں پس
جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا۔ اُس کو دوسرے
معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں۔ کہ
جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے۔ اُس کو دوسرے
معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا یعنی جھگڑا
کرنا اس کو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ
ترکیب اہل زبان کے بول چال کے بھی موافق ہے۔ اور نیز اس بھی

تین پانچ کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں بولا گیا ہے - لیکن روٹی کھانا - یا میوہ کھانا - یا پان سات - یا دس بارہ وغیرہ صرف پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پاسکتے ہیں - نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے - کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہل زبان کی بول چال کے موافق تو ضرور ہیں - مگر ان میں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا - آیندہ ہم ان دونوں معنوں میں تمیز کے لئے پہلی قسم کے محاورہ پر روز مرّہ کا اور دوسری قسم پر محاورہ کا اطلاق کریں گے

روز مرّہ اور محاورہ میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے روز مرّہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو - تقریر و تحریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے یہاں تک کہ کلام میں جس قدر کہ روز مرّہ کی پابندی کم ہوگی - اسی قدر فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائے گا - مثلاً "کلکتہ سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا - یہ جملہ روز مرّہ کے موافق نہیں ہے - بلکہ اس کی جگہ یہ ہونا چاہیے - کلکتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرا اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا" یا مثلاً - آج تک ان سے ملنے کا موقع نہ ملا" یہاں نہ ملا کی جگہ نہیں ملا چاہیے یا وہ خاوند کے مرنے سے درگور ہوئی - یہاں زندہ درگور چاہیے - یا ؎ "سو گئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہوگئیں" یہاں ہوگئیں" کی جگہ "ہوئیں" چاہیے ؎ "دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا" یہاں "کیا ہوگیا" چاہیے -

الغرض نظم ہو یا نثر - دونوں میں روز مرّہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو - نہایت ضروری ہے - مگر محاورہ کا ایسا حال نہیں ہے - محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے - تو بلاشبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر

کردیتا ہے۔ لیکن ہر شعر میں محاورہ کا باندھنا ضرور نہیں بلکہ ممکن ہے۔
کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی فصاحت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو۔ اور ممکن ہے
کہ ایک پست اور ادنیٰ درجہ کے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و
پاکیزہ محاورہ رکھدیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے۔ ۵

گوہرِ اشک سے لبریز ہے سارا دامن آجکل دامنِ دولت ہے ہمارا دامن

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا۔ باوجود اس کے شعر تعریف
کے قابل ہے۔ دوسری جگہہ بھی شاعر کہتا ہے۔

"اس کا خط دیکھتے ہیں جب صیّاد طوطے ہاتھوں کے اُڑا کرتے ہیں"

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے۔ نہ مضمون ہے۔ صرف ایک محاورہ بندھا
ہوا ہے۔ اور وہ بھی روز مرّہ کے خلاف۔ یعنی اُڑ جاتے ہیں، کی جگہہ اُڑا کرتے
ہیں، محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہئے۔ جیسے کوئی خوبصورت عضو۔ بدنِ
انسان میں۔ اور روز مرّہ کو ایسا جاننا چاہیے۔ جیسے تناسب اعضا بدنِ انسان
میں جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسنِ
بشری کامل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسی طرح بغیر روز مرّہ کی پابندی کے محض
محاورات کے جا و بیجا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہوسکتی۔
شعر کے معنوی خوبی کا اندازہ اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان دونوں کرسکتے
ہیں۔ لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ صرف اہلِ زبان کا حصّہ ہے۔ اہلِ زبان
عموماً اُس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جس میں روز مرّہ کا لحاظ کیا گیا
ہو۔ اور اگر روز مرّہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ اُن کو اور
بھی زیادہ مزہ دیتی ہے۔ مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق
ہے، عوام محاورہ یا روز مرّہ کے ہر شعر کو سُن کر سر دُھننے لگتے ہیں۔

اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور سبک ہو۔ اور
اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اِس کی وجہ یہ ہے۔
کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ جب
اُنھیں اسلوبوں میں وزن کی کھچاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں
اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں۔ تو اُن کو
ایک نوع کا تعجّب اور تعجّب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مگر خواص کی
پسند اور تعجّب کے لئے صرف روز مرّہ کا وزن کے سانچے میں ڈھال دینا کافی
نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک محض تُک بندی۔ اور محض معمولی بات چیت
کو موزوں کردینا کوئی تعجّب خیز بات نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ
ایک سنجیدہ مضمون معمولی روز مرّہ میں کمال خوبی اور صفائی اور بے تکلّفی
سے ادا کیا گیا ہے۔ تو بلاشبہ اُن کو بے انتہا تعجّب اور حیرت ہوتی ہے
کیونکہ فنِ شعر میں اور خاصکر اُردو زبان میں کوئی بات اِس سے زیادہ
مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روز مرّہ میں
پورا پورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روز مرّہ کی پابندی کو سب چیزوں
سے مقدّم سمجھا ہے۔ اُن کے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا
جاتا ہے۔ تو جا بجا فروگذاشتیں اور کسریں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی
شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روز مرّہ اور محاورہ میں
بھی پورا اُتر جائے۔ تو لا محالہ اُس سے ہر صاحب ذوق کو تعجّب ہوتا
ہے۔ مثلاً میر انشاء اللہ خاں اِس بات کو کہ افسردگی کے عالم
میں خوشی اور عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ سخت ناگوار گذرتی ہے۔
اس طرح بیان کرتے ہیں۔ شعر

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"

یا مثلاً مرزا غالب اتنے بڑے مضمون کو کہ "میں معشوق کے مکان پہ پہونچا۔ تو اوّل خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا۔ اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جانا۔ کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے"۔ دو مصرعوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں۔

روئے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

قاعدہ ہے۔ کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہے۔ اس کو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ رہتا ہے لیکن جب راز فاش ہو جاتا ہے۔ تو پھر اس کو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا۔ اس شعر میں یہی مضمون ادا کیا گیا ہے۔ دھویا جانا بے حیا اور بے لحاظ ہو جانے کو کہتے۔ اور پاک آزاد اور شہدے کو کہتے ہیں۔ رونے کے لئے دھویا جانا۔ اور دھوئے جانے کے لئے پاک ہونا۔ باوجود اتنی لفظی مناسبتوں اور محاورہ کی نشست اور روزمرّہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہوگیا ہے۔ اور کوئی بات ان نیچرل نہیں ہے۔ یا مثلاً مومن خاں کہتے ہیں۔

"کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے"

آنکھیں چرانا۔ اغماض و بے توجہی کرنا ہے۔ کھویا جانا، شرمندہ اور کھسیانہ ہونا۔ پا جانا، سمجھ جانا۔ یا تاڑ جانا۔ معنی ظاہر ہیں۔ اس شعر

کا مضمون بھی بالکل نیچرل ہے - اور محاورات کی نشست اور روز مرّہ
کی صفائی قابلِ تعریف ہے - اگرچہ اس کا ماخذ مرزا غالب کا یہ شعر ہے -
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق ✲ پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
مگر مومن کا بیان زیادہ صفائی سے بندھا ہے -
الغرض روز مرّہ کی پابندی تمام اصنافِ سخن میں عموماً - اور غزل
میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے نہایت ضروری چیز ہے - اور محاورہ بھی بشرطیکہ
سلیقہ سے باندھا جائے - شعر کا زیور ہے -

نیچرل شاعری

نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے - جو لفظاً و معنیً دونوں
حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو - لفظاً نیچر کے موافق
ہونے سے یہ غرض ہے - کہ شعر کے الفاظ اور اُن کی ترکیب و بندش
تا بمقدور اُس زبان کے معمولی بول چال کے موافق ہو - جس میں وہ
شعر کہا گیا ہے - کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روز مرّہ اُس ملک
والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم
رکھتے ہیں - پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال
اور روز مرّہ سے بعید ہوگا - اُسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا - معنیً
نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے - کہ شعر میں ایسی باتیں بیان
کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں - پس
جس شعر کا مضمون اِس کے خلاف ہوگا - وہ اَن نیچرل سمجھا جائے گا
مثلاً میر حسن دہلوی کے یہ اشعار -

کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی دانتوں میں انگلی کو دبا — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب"

اِن دونوں شعروں کو نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ بیان بھی بول چال کے موافق ہے۔ اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقع پر وہ لایا گیا ہے وہاں ہمیشہ ایسا ہی واقع ہوا کرتا ہے۔ یا مثلاً **ذوق** کا یہ شعر ہے۔

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ — جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح"

اِس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت انسان اپنے دل سے اِسی طرح مشورہ کیا کرتا ہے۔ یا مثلاً **ظفر** کا یہ شعر ہے

ترے رخسار و گیسو کو بتا تشبیہ دوں کیونکر — نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہے سنبل میں بو ایسی"

اِس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ اور کوئی بو معشوق کے رنگ و بو سے بہتر۔ یا اُس کے برابر نہیں معلوم ہوتی۔ یا مثلاً **مومن خاں** کا یہ شعر ہے۔

"تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا۔ کیونکہ جس سے تعلقِ خاطر بڑھ جاتا ہے۔ اُس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیشِ نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً **داغ** کے یہ اشعار ہیں۔

"طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی — چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی
رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں — یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی"

اِن دونوں شعروں کا مضمون گو ایک دوسرے کے ضد معلوم ہوتا ہے مگر دونوں اپنی اپنی جگہ نیچر کے مطابق ہیں۔ فی الواقع ہوا و ہوس کا چھوٹ

بڑے زور شور کے ساتھ سر پر چڑھتا ہے۔ مگر بہت جلد اتر جاتا ہے۔ اور فی الواقع دنیا کی خواہشوں سے کبھی تبیعت سیر نہیں ہوتی یا مثلاً غالب کا یہ شعر ہے۔

"رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں"

یہ شعر بھی نیچرل ہے۔ اور فطرت انساں کے کسی قدر گہری اور پوشیدہ خاصیت کا پتا دیتا ہے۔ جس کے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اُس سے انکار نہیں کرسکتا۔

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے۔ ایسے ہیں جن کو لفظاً اور معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچرل کہنا چاہیئے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے ہیں جن کو لفظاً یا معنیً یا دونوں حیثیتوں سے نیچرل نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً ناسخ کا یہ شعر ہے۔

"کبھی ہے دھیان عارض کا کبھی یاد مژہ دلکو   کبھی ہیں خار پہلو میں کبھی گلزار پہلو میں"

اِس شعر کو صرف لفظاً نیچرل کہا جاسکتا ہے۔ لیکن معنیً نہیں کہا جاسکتا معشوق کے تصوّر سے بلاشبہ عاشق کو فرحت ہوسکتی ہے۔ اور رنج بھی۔ لیکن جب فرحت ہو۔ تو عارض اور مژگاں دونوں کے تصوّر سے فرحت ہونی چاہیئے۔ اور جب رنج ہو تو دونوں کے تصوّر سے رنج ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ پلکیں جو خار سے مشابہ ہیں۔ اُن کے تصوّر سے پہلو میں خار ہوں۔ اور عارض جو گُل سے مشابہ ہے۔ اُس کے تصوّر سے پہلو میں گلزار ہو یا مثلاً غالب کا یہ شعر ہے۔

"عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں   کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا"

جو ہر اندیشہ میں کیسی ہی گرمی ہو۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس میں صحرا نورد کا خیال آنے سے خود صحرا جل اٹھے۔ یا مثلاً امیر مینائی کا یہ شعر ہے۔

کیا نزاکت ہے جو توڑے شاخِ گل سے کوئی پھول
آتشِ گل سے پڑے چھالے تمھارے ہاتھ میں"

نزاکت کسی درجہ کی کیوں نہ ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ آتشِ گل یعنی خود گل کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں۔ یا مثلاً ذوق کا یہ شعر ہے۔

"دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا"

سرد مہری میں اتنی ٹھنڈک ہو سکتی ہے جتنی کہ لفظاً سرد میں پھر اس کے کشتہ کی خاک میں اتنا اثر ہوتا کہ اس سے شجر کافور پیدا ہو۔ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں جن میں معنی کا بالکل نشان نہیں۔

ہر زبان میں نیچرل شاعری ہمیشہ قدما کے حصہ میں رہی ہے۔ مگر قدما کے اول طبقہ میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ انھیں کا دوسرا طبقہ اس کو سڈول بناتا ہے۔ اور سانچے میں ڈھال کر اس کو خوشنما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ مگر اس کی نیچرل حالت کو اس خوشنمائی اور دلربائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ ان کے بعد متاخرین کا دورہ شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہیں رکھتے۔ اور خیالات کے اسی دائرہ میں محدود رہتے ہیں۔ جو قدما نے ظاہر کئے تھے۔ اور نیچر کے اس منظر سے جو قدما کے پیش نظر تھا۔ آنکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھتے۔ تو ان کی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل

حالت سے تنزّل کرتی ہے - یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہِ راست سے بہت دُور جا پڑتے ہیں - اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہیئے - کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم کچّے - اور آلونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے - اُنھیں پانی میں اُبال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا - اُنھوں نے اپنی معمولی غذا سے اُسی کو بہت غنیمت سمجھا - دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلواکر اور دال کو دُھوکر مناسب مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیّار کیا - اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی کے پکانے میں اپنی اُستادی ظاہر کرنی چاہتا ہے - اس کے سوا اور کوئی موقع تنوّع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا - کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے -

اسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دلنشیں کرنے میں کوشش کرتے ہیں - فرض کرو - کہ فارسی زبان میں جس پر اردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے - جن لوگوں نے اوّل غزل لکھی ہوگی - ضرور ہے - کہ اُنھوں نے عشق و محبّت کے اسباب اور دواعی محض نیچرل اور سیدھے سادے طور پر معشوق کی صورت حُسن و جمال - نگاہ اور نازو انداز وغیرہ کو قرار دیا ہوگا - ان کے بعد لوگوں نے اُنھیں باتوں کو مجاز اور استعارہ کے پیرایہ میں بیان کیا - مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزہ و ناز و ادا کو مجازاً تیغ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا - اور اس جدّت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف و بامزہ ہوگیا - متاخرین جب اسی مضمون پر چل پڑے - اور اُن کو قدما کے استعارے سے بہتر کوئی اور استعارہ ہاتھ نہ آیا - اور جدّت پیدا کرنے کا

خیال دامنگیر ہوا۔ اُنھوں نے تیغ و شمشیر کے مجازی معنوں سے قطع نظر کی اور اُس سے خاص سروہی یا اصیل تلوار مراد لینے لگے۔ جو قبضہ یا باڑھ۔ پھیلا۔ آب اور تاب اور ڈاب سب کچھ رکھتی ہے۔ میان میں رہتی ہے۔ گلے میں حمائل کی جاتی ہے۔ زخمی کرتی ہے۔ ٹکڑے اُڑاتی ہے۔ سر اُتارتی ہے۔ خون بہاتی ہے۔ جو رنگ کاٹتی ہے۔ اُس کی دھار تیز بھی ہوسکتی ہے۔ اور کُند بھی۔ قاتل کا ہاتھ اُس کے مارنے سے تھک سکتا ہے۔ وہ قاتل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر سکتی ہے۔ اُس کے مقتول کا مقدمہ عدالت میں دائر ہوسکتا ہے۔ اُس کا قصاص لیا جاسکتا ہے۔ اُس کے وارثوں کو خون بہا دیا جاسکتا ہے۔ غرضکہ جو خواص ایک لوہے کی اصلی تلوار میں ہوسکتے ہیں۔ وہ سب اُس کے لیئے ثابت کرنے لگے۔

یا مثلاً اگلوں نے کسی پر عاشق ہوجانے کو مجازاً دل دادن یا دل باختن یا دل فروختن سے تعبیر کیا تھا۔ رفتہ رفتہ متاخّرین نے دل کو ایک ایسی چیز قرار دے لیا۔ جو کہ مثل ایک جواہر یا ایک پھل کے ہاتھ سے چھینا جاسکتا ہے۔ واپس لیا جاسکتا ہے۔ کھویا اور پایا جاسکتا ہے کبھی اُس کی قیمت پر تکرار ہوتی ہے۔ سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے۔ ورنہ نہیں دیا جاتا۔ کبھی اُس کو معشوق عاشق سے لیکر کسی طاق میں ڈال کر بھول جاتا ہے۔ اتفاقاً وہ عاشق کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ اور وہ آنکھ بچاکر وہاں سے اُڑا لاتا ہے۔ پھر معشوق کے ہاں اُس کی ڈھنڈیا پڑتی ہے۔ اور عاشق اُس کی رسید نہیں دیتا۔ کبھی وہ یاروں کے جلسہ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ سارا گھر چھان مارتے ہیں۔ کہیں پتہ نہیں لگتا۔ اتفاقاً معشوق جو بالوں میں کنگھی

کرتا ہے تو وہ جوں کی طرح جھڑ پڑتا ہے کبھی وہ ایسا تلپٹ ہو جاتا ہے
کہ زلفِ یار کی ایک ایک شکن اور ایک ایک لٹ میں اُس کی تلاش
کی جاتی ہے۔ مگر کہیں کچھ سُراغ نہیں ملتا۔ کبھی وہ بیع بالخیار کے قاعدے
سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے۔ کہ پسند آئے تو
رکھنا ورنہ پھیر دینا۔ اور کبھی اُس کا نیلام بول دیا جاتا ہے کہ جو
زیادہ دام لگائے۔ وہی لیجائے۔

یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اِس لئے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار
کرتا ہے مجازاً صیّاد باندھا تھا۔ پچھلوں نے رفتہ رفتہ اس پر تمام احکام
حقیقی صیّاد کے مترتّب کردئے۔ اب وہ کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے۔
کہیں اُس کو تیر مار کر گراتا ہے۔ کہیں اُن کو زندہ پنجرے میں بند
کرتا ہے۔ کہیں اُن کے پر نوچتا ہے کہیں اُن کو ذبح کرکے زمین پر
تڑپاتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر و کمان لگا کر جنگل کی طرف جا نکلتا ہے
تمام جنگل کے پنچھی اور پکھیرو اُس سے پناہ مانگتے ہیں۔ سینکڑوں
پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا۔ بیسیوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں
اور لوؤں اور بٹیروں کے اُس کے دروازے پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے
چڑی مار اُس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشقِ الٰہی یا محبّتِ روحانی کو جو ایک انسان
کو دوسرے انسان کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ مجازاً شراب کے نشہ سے تعبیر
کیا تھا۔ اور اِس مناسبت سے جام و صراحی۔ خُم و پیمانہ۔ ساقی و
مے فروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کئے تھے۔ یا بعض
شعرائے متصوّفین نے شراب کو اس وجہ سے کہ وہ اِس دارالغرور کے

تعلقات سے تھوڑی دیر کو فارغ البال کرنے والی ہے۔ بطور تفاول کے موصل الی المطلوب قرار دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اور اُس کے تمام لوازمات اپنے حقیقی معشوق میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشاعرہ بلا مبالغہ کلال کی دُکان بن گئی۔ ایک کہتا ہے لا۔ دوسرا کہتا ہے اور لا۔ تیسرا کہتا ہے پیالہ نہیں تو اوک ہی پلا۔ کچھ بہک رہے ہیں۔ کچھ پکار رہے ہیں۔ کوئی واعظ پر پھبتی کہتا ہے۔ کوئی زاہد کی ڈاڑھی پر ہاتھ لپکاتا ہے۔ کوئی شیخ کی پگڑی اُچھالتا ہے۔ جوان بوڑھے۔ جاہل اور عالم رند اور پارسا سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جو ہے۔ نشہ کے خمار میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جدھر دیکھو۔ العطش العطش کی پکار ہے۔

اسی طرح متاخرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچرل طور پر باندھ گئے تھے نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہونچا دیا۔ معشوق کے دہن کو تنگ کرتے کرتے صفحۂ روزگار سے یک قلم مٹا دیا۔ کمر کو پتلی کرتے کرتے بالکل معدوم کر دیا۔ زلف کو دراز کرتے کرتے عمر خضر سے بڑھا دیا۔ رشک کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بھی بدگمان بن گئے۔ جدائی کی رات کو طول دیتے دیتے ابد سے جا بھڑایا۔ الغرض جب پچھلے اُنہیں مضامین کو جو اگلے باندھ گئے ہیں۔ اوڑھنا اور بچھونا بنا لیتے ہیں۔ تو اُن کو مجبوراً نیچرل شاعری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ اَن نیچرل ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ ممکن ہے۔ کہ متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں۔ جو قدما کی جولانگاہ کے علاوہ ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں۔ یا اُسی جولانگاہ کو کسی قدر وسعت دیں۔ یا زبان میں نسبتً

متقدمین کے زیادہ گھلاوٹ اور لوچ وسعت اور صفائی پیدا کر سکیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے۔ اسی طرح دلی میں ذوق۔ ظفر۔ اور خاصکر داغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت و صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی اردو نثر پر ریویو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت بضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط۔ جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے۔ نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت مہر نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی۔ ضرور ہے۔ کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنے طرز خاص میں شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے۔ کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ کہ "فارسی زبان میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر

کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے۔ اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہوگئے قوے غالب — اب عناصر میں اعتدال کہاں

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے۔ وہی اُس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے۔ مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے۔ ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے۔ اور اُن کی اُردو زبان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا۔ نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ داں اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جن پر مجھکو ناز ہے۔ کوئی اُن کا لطف نہیں اُٹھاتا۔ مگر بطریق اذعان۔ کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے داد سخن کہاں؟ اور ادراک پایہ معنی کہاں؟۔ مہر نیمروز کے پانسات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں۔ میری خاطر نہ کیجئے۔ انصاف سے کہئے۔ کہ یہ نثر کہیں اور ہے۔ اور پھر اُس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو؟"

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہئے۔ ویسی نہیں ہوئی چنانچہ بعض اوقات تحریروں میں دیکھا گیا۔ کہ اُردوے معلی اور بوستان خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے قدرداں بہ نسبت ناقدر والوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں۔ اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں۔ لطائف غیبی۔ تیغ تیز اور نامۂ غالب اس کے سوا چند اجزا ایک نا تمام قصّے کے بھی ہیں۔ جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز اُن کے خطوط ہیں۔ جن میں زیادہ تر اُردوے معلّٰی میں اور اُس سے کم عود ہندی میں جمع کرکے چھپوائے گئے ہیں۔

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا۔ اور نہ اُن کے بعد کسی سے اُس کی پُوری پُوری تقلید ہو سکی۔ اُنھوں نے القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں۔ جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا۔ مگر درحقیقت فضول اور دُور از کار تھیں سب اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں۔ کبھی برخوردار۔ کبھی بھائی صاحب۔ کبھی مہاراج۔ کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اُس کے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اِس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

اداے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے۔ جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُن کو یہ لکھنا تھا۔ کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا۔ کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟۔ اُس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا۔ کہ آج نہ جائینگی؟ اُس نے کہا آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے۔ اِس مطلب کو

اُنھوں نے اِس طرح ادا کیا ہے "محمد علی بیگ اِدھر سے نکلا" بھئی محمد علی بیگ! لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت! ابھی نہیں
کیا آج نہ جائیں گی؟ "آج ضرور جائیں گی - تیاری ہو رہی ہے"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے - اِس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے - اور اُن سے یہ یہ باتیں ہوئیں - مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُس کو اِس طرح شروع کرتے ہیں -

"آئیے میرن صاحب!" "السّلام علیکم" "حضرت!" آداب "کہو صاحب! آج اجازت ہے - میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی" "حضور! میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں - پھر آپ کیوں تکلیف کریں" "نہیں میرن صاحب - اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں - وہ خفا ہوا ہوگا - جواب لکھنا ضرور ہے" "حضرت! - وہ آپ کے فرزند ہیں - آپ سے خفا کیا ہوں گے" "بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ - کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو" "سبحان اللہ! - اے لو حضرت! - آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھ سے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے" اچھا تم باز نہیں رکھتے - مگر یہ کہو - کہ تم کیوں نہیں چاہتے - کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں" "کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے - کہ جب آپ کا خط جاتا - اور وہ پڑھا جاتا - تو میں سنتا - اور حظ اُٹھاتا - اب جو میں وہاں نہیں ہوں - تو نہیں چاہتا - کہ آپ کا خط جائے - میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں - میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا" "میاں! - بیٹھو - ہوش کی خبر لو تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ - میں بوڑھا آدمی - بھولا

آدمی تمھاری باتوں میں آگیا۔ اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ؟ اِس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہوکر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُس کو غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے اندازِ بیان سے واقف نہیں۔ وہ اُس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں۔ میر مہدی جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں عبارت اُردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے۔ کہ مجھکو رشک آنے لگا ہے۔ سُنو۔ دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اُس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔

ظاہر ہے۔ کہ اِس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں۔ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی تحصیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اُس کے دوسرے معنی سمجھ لیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلےؔ کا رہنے والا ہے۔ اِن الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لُطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر اُن کو سمجھایا۔ کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے۔ میری نسبت نہیں لکھا۔ اُسی قدر اُن کو اِس بات کا زیادہ خیال ہوا۔ کہ میں از راہِ کسر نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں۔ اُن میں اکثر اِس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر

دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں پر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھدی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا۔ اور جواب کہاں سے شروع ہوا مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے۔ اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال و جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں۔ جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ سوال کیا ہے۔ جواب کیا۔ شاید "قصے" یا ناولوں میں یہ بات نہ چل سکے۔ مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ کہ اور لوگ اُس کی پیروی نہ کر سکیں۔ مگر وہ چیز جس نے اُنکے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ شوخیٔ تحریر ہے۔ جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہوسکتی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بعض لوگوں نے خط و کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی اور ظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر اُن کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے۔ جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلّاق ہے۔ اُس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی۔ جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی۔ اخلاقی پولیٹیکل۔ سوشل۔ اور ریلیجیس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دئے ہیں۔

بائیوگرافی اور ناولوں میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بہ لحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے۔ کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے۔ کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا۔ اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی۔ اور اب جوان ہوگئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں۔ "کیوں بھئی! اب ہم اگر کول آئے بھی۔ تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟" یا مثلاً نواب امیرالدین احمد خاں کو جو اب رئیس لوہارو ہیں۔ ان کے بچپن کے زمانے میں ان کے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں۔ "اے مردم چشم جہاں بیں غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو۔ یعنی چشم جہاں بیں۔ غالب کی پتلی۔ چشم جہاں بیں تمھارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر۔ اور پتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امیرالدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمھارا دل دادہ ہوں۔"

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انھوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں ان کو اس طرح لکھتے ہیں۔ "دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو

پسند نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے خط کا جواب ۱۸۵۸ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزا
یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا۔ تو یہ کہو گے۔ کہ میں نے دوسرے ہی
دن جواب لکھا ہے۔"

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔ "دھوپ
بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں کبھی
پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے
لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں۔ اور یہ صاحب
فرماتے ہیں۔ کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور
چیز ہے۔ اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

جس زمانے میں برہان قاطع پر اعتراض لکھے ہیں۔ اور لوگوں نے
مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلف برہان کی حمایت کی ہے۔ ایک خط میں
صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اس کی اور اس کے طرفداروں کی
نسبت لکھتے ہیں۔ "ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے
نزدیک صحیح سمجھا۔ وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ
ہو۔ تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ ایک
گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے"

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاء الدین خاں کو لکھا ہے۔
لکھتے ہیں "استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھپھی ان کی چچی
تھیں۔ اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اس رو سے کہ
دوست ہیں۔ اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے
سلام۔ اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں۔ بندگی [illegible]"

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں۔ دیوان خانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔

نواب علاء الدین خاں اور اُن کے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں۔ اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاء الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں "سنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے از راہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے تمھیں پوچھا۔ کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے۔ کہ جب میں یہاں آیا۔ تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اِس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ اتنا ہی جتنا تم اُس کو چاہتے ہو؟ ہنسنے لگے۔ غرضکہ میں نے بظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے"۔

ایک دفعہ کثرت اخراجات سے تنگ آ کر بعض ضروری خرچ بند کر دئے ہیں۔ یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ نواب علاء الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اِس کا سبب دریافت کیا۔ اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو شعر لکھا ہے۔ "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو"۔ اُس کا جواب اِس طرح لکھتے ہیں۔ "بھائی کو سلام کہنا۔ اور کہنا۔ کہ صاحب! وہ زمانہ نہیں ہے وہ متھرا داس سے قرض لیا۔ اُدھر درباری مل کو جا مارا۔ اِدھر

خوب چند- چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی- ہر ایک پاس تمسّک مہری
موجود شہد لگاؤ اور چاٹو- نہ مول نہ سود- اِس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی
کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر- با ایں ہمہ کبھی خاں نے کچھ دیدیا کبھی
الور سے کچھ دلوا دیا- کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیجدیا- اب میں اور
باسٹھ روپے آٹھ آنے کالکٹری کے- سَو روپے رام پور کے- قرض
دینے والا ایک مختار کار- وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے- مول میں قسط
اس کو دینی پڑی- انکم ٹکس جدا- چوکیدار جدا- سود جدا- مول جدا-
بی بی جدا- بچے جدا- شاگرد پیشہ جدا- آمد وہی ایک سَو باسٹھ- تنگ
آگیا- گذارا مشکل ہوگیا- روز مرّہ کا کام بند رہنے لگا- سوچا کہ کیا کروں؟
کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش- صبح کی تبرید
متروک- چاشت کا گوشت آدھا- رات کی شراب و گلاب موقوف- بیس
بائیس روپے کی منہائی- روز مرّہ کا خرچ چلا- یاروں نے پوچھا- تبرید و
شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا- کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے- پوچھا
کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا- کہ جس طرح وہ جلائیں گے-
بارے- مہینہ پورا نہیں گذرا تھا- کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے
اور روپیہ آگیا- قرض مقسط ادا ہوگیا- متفرق رہا خیر رہو- صبح کی تبرید
رات کی شراب جاری ہوگئی- گوشت پورا آنے لگا- چونکہ بھائی نے وجہ
موقوفی و بحالی پوچھی تھی- ان کو یہ عبارت پڑھا دینا"

ایک خط میں تعلقاتِ خانہ داری کی اِس طرح شکایت کرتے ہیں-

دوستو! عالم دو ہیں- ایک عالم ارواح- اور ایک عالم آب و گل- حاکم
ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے- لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْم

اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے۔ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّار۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے۔ کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے۔ کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے۔ اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار۔ ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ۔ مراد آباد ہوتا ہوا۔ رامپور پہونچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا۔ کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا۔ کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔"

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہوں۔ یہاں تک

کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے خالی نہیں ہوتا۔
منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں۔ بھائی صاحب! میں بھی تمہارا
ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸۔ ربیع الاول کو شام کے وقت
میری وہ پھپھی۔ کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا۔ اور
وہ بھی مجھکو بیٹا سمجھتی تھی۔ مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے۔ کہ پرسوں میرے
گویا نو آدمی مرے۔ تین پھپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی
اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا۔ کہ یہ نو آدمی
زندہ ہیں۔ اور اس کے مرنے سے جانا۔ کہ یہ نو۹ آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے۔ اس کی کیفیت ایک
خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں "صاحب! تم
جانتے ہو۔ کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اور کیا موقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا۔
کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں
معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے
میں ایک اور بزرگ تھے۔ کہ وہ ہمارے تمہارے دوست۔ اور منشی نبی بخش
ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص
نہ وہ معاملات۔ نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر
دوسرا جنم ہمکو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی
ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھکو
آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص
بہ تفتہ ہو۔ آج آیا۔ اور جس شہر میں میں ہوں۔ اس کا نام بھی دلی
اور اس محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست

اس جنم کے دوسنتوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ! ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب۔ کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں۔ تو باہر کے ہیں۔ ہندو البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔

بعض خطوط میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا بیان نہایت مؤثر طریقے میں کیا ہے۔ جس سے اُن کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

ایک خط میں لکھتے ہیں "ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کردیا۔ ضعف۔ سستی۔ کاہلی۔ گراں جانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخش دیا۔ تو خیر۔ اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے۔ اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے۔ اور ہم ہیں۔ ہائے! کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "تم مشقِ سخن کر رہے ہو۔ اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے۔ باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا۔ تو کیا؟ اور مسلمانوں میں نبی ہوا۔ تو کیا؟ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا؟ اور گمنام جیئے۔ تو کیا؟ کچھ معاش ہو۔ کچھ صحتِ جسمانی۔ باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر میں ابھی اسی پایہ پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے۔ اور وجہِ معیشت اور صحت و

راحت سے بھی گذر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گذر پاؤں جس سناٹے میں ہوں۔ وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور نہ ہوئے۔ اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا۔"

مرزا نے بعض اردو خطوط میں اور خاصکر اردو تقریظوں میں مسجّع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات باردہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنّع اور ساختگی کی متحمّل نہیں معلوم ہوتی۔ مگر مرزا نے جس قسم کی مسجّع عبارت اردو خطوط یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے۔ اُس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجّع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تو اُس میں تصنّع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجّع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اُس شخص سے بن پڑتی ہے۔ جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجہ کا کمال رکھتا ہو۔ اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اُس کی مثالیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اردو رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مگر

معلوم رہے کہ مقتضا عبارت مرزا خاصکر اُن خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان۔ مصائب کا ذکر۔ یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار۔ ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے۔ مثلاً سید یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"یوسف مرزا کیونکر تجکو لکھوں۔ کہ تیرا باپ مرگیا۔ اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو؟ مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے۔ ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُس سے کہتے ہیں۔ کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہونگا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں۔ کہ رہائی کا حکم ہوچکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے۔ تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی۔ نہ قیدِ فرنگ۔"

اُنھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں۔ "اے میری جان! اے میری آنکھ! وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہکر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے۔ تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تمکو جیتا رکھے۔ اولاد بہت نانا۔ نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے۔ کہ وہ

اِس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟ - ہاں مظفر الدولہ کا غم منجملہ واقعاتِ کربلا سے معلّیٰ ہے - یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔"

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں - اور اُن سب میں مسجّع اور مقفےٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے خطوں میں پائی جاتی ہے - وہ اِن تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے - خصوصاً تسجیع کی رعایت نے اُن میں آورد اور تصنّع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے - لیکن مرزا کو اُس میں معذور سمجھنا چاہیے - جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے - وہ بغیر تکلفات بارِدہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے - جو طریقہ اِس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے - اُس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں - اور مرزا کے وقت میں تو اُس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا - با ایں ہمہ اُن میں سے بعض نثریں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں -

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

پیدائش اعظم گڈھ ۱۸۵۷ء وفات اعظم گڈھ ۱۹۱۴ء

آپ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک مشہور خاندان میں پیدا ہوئے آپ نے منطق فلسفہ ادب مشہور ادیب مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی سے حاصل کیا - اور علم حدیث مولوی حافظ احمد علی صاحب محدّث سہارنپوری سے - اور فقہ مولوی ارشاد حسین صاحب سے اور تفسیر اور کچھ علم ادب مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے اخذ کیا - ۱۷ سال کی عمر میں آپ نے درسِ نظامیہ سے بالکل فراغت حاصل کر لی - مگر

تعلیم سے فراغت کے بعد چند روز آپ امین عدالتِ دیوانی رہے۔ یہ ملازمت پسند نہ آئی۔ چھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں سمیع اللہ خاں صاحب کی سفارش سے سر سیدؒ نے اُن کو کالج کی پروفیسری عنایت کی۔ ۱۶ برس تک کالج سے یہ تعلق آپ کو رہا۔ اُسی زمانے میں پروفیسر آرنالڈ نے آپ کو علومِ جدیدہ سے آگاہ کیا۔ اور فرنچ زبان سکھلائی اور خود ان سے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ کالج کے تعلق ہی کے زمانے میں آپ نے بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ الفاروقؓ کے لیے تاریخی مواد فراہم کریں۔ کچھ عرصے کے بعد سیرِ کشمیر کو گئے۔ وہاں کے ملیریا نے سخت نقصان پہونچایا۔ صحت نے اُسی وقت سے جواب دے دیا۔ ۱۸۹۴ء میں ۳۷ سال کی عمر میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ کی جانب سے عطا ہوا۔ مدت تک الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو رہے۔

سر سیدؒ کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں آپ کالج سے علحدہ ہوکر حیدرآباد تشریف لے گئے۔ وہاں سلسلۂ آصفیہ میں دوسو روپیہ ماہوار وظیفۂ تصنیف آپ کو مقرر ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد تین سو روپیہ ہوگیا۔ عرصے تک وہیں مقیم رہ کر تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔ حیدر آباد سے واپس آکر لکھنؤ میں قیام کیا۔ اور ندوۃ العلماء کے کام میں مشغول ہوئے آخر عمر میں تمام تعلقات کو ترک کرکے سیرۃ نبوی کی تالیف و تصنیف میں مشغول ہوئے۔ ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو ۱۵ دن اسہال کے عارضہ میں مبتلا رہ کر اپنے وطنِ مالوف اعظم گڑھ میں انتقال کیا۔

آپ فطرۃً ذہین اور سلیم الطبع تھے۔ تاریخ اور فلسفہ سے آپ کو ابتدا سے دلچسپی تھی۔ علومِ مشرقیہ میں خاص استعداد تھی۔ طرزِ بیان آپ کا سادہ۔ مگر زور دار اور مدلل تھا۔ تحریر فلسفیانہ اور محققانہ تھی۔ جس میں سچے تاریخی

واقعات ہوتے تھے۔ رنگ آمیزی کو دخل نہ تھا۔ عربی نظم و نثر پر اچھی قدرت تھی فارسی نظم کسی طرح کاملین اہل زبان سے الگ نہیں ہو سکتی۔ اردو میں اُن کا حُسن بیان ایسا تھا۔ کہ سرسیّد فرماتے تھے کہ" اہل دہلی اس پر رشک کرتے ہیں" تصنیفات آپ کی بہت ہیں۔ حسب ذیل تصنیفات زیادہ مشہور ہیں۔

سفر نامہ مصر و رُوم و شام۔ الفاروق۔ الغزالی۔ النعمان۔ المامون۔ الکلام۔ الجزیہ۔ تاریخ اسلام۔ سوانح مولانا رُوم۔ اورنگ زیب۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ شعر العجم ۵ جلدوں میں آپ کی آخری تصنیف سیرۃ النبی چار جلدوں میں ہے۔ جس کو نا تمام چھوڑا۔

میر انیس کی شاعری کے خصوصیات

فصاحت

علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے۔ کہ لفظ میں جو حروف آئیں۔ اُن میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نا مانوس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے۔ اور چونکہ آوازیں بعض شیریں دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطی اور بلبل کی آواز۔ اور بعض مکروہ اور ناگوار مثلاً کوّے اور گدھے کی آواز۔ اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شستہ سبک و شیریں۔ اور بعض ثقیل بھدّے ناگوار۔ پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں۔ اور دوسری کو غیر فصیح۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ فی نفسہ ثقیل و مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں اُن کا استعمال

نہیں ہوا ہے۔ یا بہت کم ہوا ہے۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کیے جاتے ہیں۔ تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کو فنِ بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں۔ اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کیے جاتے ہیں۔

میر انیس کی کمالِ شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے اُردو شعرا میں سے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے۔ اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ اُن کو استعمال کرنے پڑے۔ تاہم اُن کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی فارسی کے الفاظ جو اُردو زبان میں کم مستعمل ہیں ضرورت سے لانے پڑے ہیں لیکن اس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں۔ فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں۔ جس سے اِن کی غرابت کم ہوگئی ہے۔ ورنہ اگر اُردو کی خاص ترکیب میں اِن الفاظ کا استعمال کیا جاتا۔ تو بالکل خلافِ فصاحت ہوتا۔ مثلاً انگشتری۔ خاتم۔ رخ۔ بادہ۔ ثنا۔ حسن۔ اور اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں۔ جو بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن ٹھیٹ اُردو میں اُن کا استعمال نہیں ہوتا۔ میر ضمیر ایک موقع پر کہتے ہیں ؎ "ذریتِ رسول کی خاطر جلائی نار"۔ نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے۔ لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اُردو میں مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً نارِ دوزخ۔ نارِ جہنم۔ تو وہ غرابت نہیں رہتی۔

فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے۔ بعض الفاظ فصیح ہیں۔ بعض فصیح تر۔ بعض اس سے بھی فصیح تر۔ میر انیس صاحب کے کلام کا

بڑا خاصہ یہ ہے۔ کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے۔ تو اُن کے مقابلہ میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے۔ تو میر صاحب کے یہاں فصیح تر ہوں گے۔ مرزا دبیر کی تخصیص نہیں۔ تمام مرثیہ گویوں کے مقابلہ میں میر انیس صاحب کے کلام کا یہی حال ہے۔

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں۔ جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔

مرزا دبیر "کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں"
میر انیس "سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں"
مرزا دبیر "آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو"
میر انیس "آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو"
مرزا دبیر "رویا میں بھی حسینؑ کو رویا ہی کرتے ہیں"
میر انیس "حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے"
مرزا دبیر "جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحب مکاں"
میر انیس "جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے"

ابتذال

فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے۔ کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ آسان کثیر الاستعمال ہو۔ اس لئے لوگ مبتذل

اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ اِن دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ مرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میرانیس کی تقلید کرتے ہیں۔ اکثر اُن کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔ مثلاً جہاں حضرت شہر بانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے۔ حضرت شہر بانو کی زبان سے فرماتے ہیں ع "ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور" ایک اور جگہ فرماتے ہیں ع

"تارہ تو اِن کی سال گرہ کا نکال لا"

ابتذال کی صاف اور بیّن مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے۔ اگر یہ مبتذل نہوتا۔ تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے "ٹکر" کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں۔ کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں۔ وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں۔ لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار مذاقِ صحیح کے سوا کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے۔ کہ یہ لفظ مبتذل اور پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کی جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے لیکن یہ اُن کی انتہائی درجہ کی قادر الکلامی ہے۔ کہ پھر بھی اُن کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبّہ نہیں آنے پاتا۔

کلام کی حفاظت

یہ بحث مفرد الفاظ کے متعلق تھی۔ لیکن کلام کی فصاحت میں صرف

لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضرور ہے۔ کہ جن الفاظ کے ساتھ
وہ ترکیب میں آئے۔ اُن کی ساخت ہیئت۔ نشست۔ سُبکی۔ اور گرانی کے
ساتھ اُس کو خاص تناسب اور توازن ہو۔ ورنہ فصاحت قائم نہ رہیگی۔
میر انیس کا مصرع ہے ع "فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور" صحرا اور
جنگل ہم معنی ہیں۔ اور دونوں فصیح ہیں۔ میر انیس نے جا بجا ان
دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے۔ اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا
ہے۔ لیکن اگر اس مصرع میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے
تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ میر صاحب کا ایک شعر ہے ؎

"طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں"

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ۔ تو مصرعہ پھسپھسا ہو جاتا ہے۔
شبنم اور اوس ہم معنی ہیں۔ اور برابر درجہ کے فصیح ہیں۔ لیکن
میر صاحب کے اس شعر میں ؎

mv ahmad

"تھا کھاکے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا"

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے۔ تو فصاحت خاک میں ملجائیگی
لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے۔ اس مصرعہ میں
ع "شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے" شبنم کے بجائے اوس لاؤ
تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائیگی۔

اس میں نکتہ یہ ہے۔ کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے۔ اس لئے
یہ ضرور ہے۔ کہ جن الفاظ کے سلسلہ میں وہ ترکیب دیا جائے۔ اُن آوازوں
سے اُس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سُروں کو ترکیب
دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُروں کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے

خود دلکش اور دلآویز ہے۔ لیکن اگر دو مخالف سُروں کو باہم ترکیب دیدیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔

راگ کے دلکش اور مؤثر ہونے کا گر یہی ہے۔ کہ جن سُروں سے اسکی ترکیب ہو۔ اُن میں نہایت تناسب و توازن ہو۔ الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صورت اور سُر ہیں۔ اس لئے اُن کی لطافت شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے۔ جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی کے ہیں اُن کے مناسب ہوں۔

میرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرعہ ہے۔ ع۔

"زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے"

اس میں جتنے الفاظ ہیں۔ یعنی زیرِ قدمِ والدہ۔ فردوس بریں سب بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس قدر بھدا اور گراں ہے۔ کہ زبان اس کا تحمل نہیں کرسکتی۔ شاید تم کو خیال ہو۔ کہ مصرعہ کی ترکیب چونکہ فارسی ہوگئی ہے اس لئے ثقل پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں سیکڑوں شعروں میں اسی قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں۔ لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں۔ ؎

مَیں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں　　مَیں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں

پہلے مصرعہ میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافت بھی موجود ہے۔ لیکن یہ بھدا پن اور ثقل نہیں ہے۔

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب توازن۔ توافق پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود

بھی فصیح ہوتے ہیں۔ تو وہ پورا مصرع یا شعر فصیح کہا جاتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی۔ نشست کی خوبی۔ ترکیب کی دلاویزی۔ برجستگی۔ سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الفاظ کے توازن اور تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میر انیس حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہیں ع "تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں"۔ اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں ع "بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسول میں" وہی مضمون ہے۔ وہی الفاظ ہیں۔ لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا ہے۔

میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے۔ اور اُن کا ہر شعر اِس وصف کا مصداق ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اِس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ ؎

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

ذرّہ کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں
کانٹوں کی نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر
تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں ادھر

چکّر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور
پانی میں تھے نہنگ اُبھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

چھایا تھا سب پہ رعبِ علمدارِ نوجواں
تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشاں

گوشہ اماں کا ڈھونڈھ رہی تھی ہر اک کماں
ترکش بھی تھے ہراس سے کھولے ہوئے زباں

ہنروں کا بے گماں تھا ارادہ گریز کا	منہ کند ہوگیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے۔ وہ بحال خود قائم رہے۔ مثلاً فاعل مفعول۔ مبتدا۔ خبر۔ متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں۔ یہ ہی ترتیب شعر میں بھی قائم رہے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہٖ قائم رہنا قریب قریب نا ممکن ہے صرف ایک آدھ شعر۔ یا بہت سے بہت شعر دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے۔ کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے۔ جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے۔ اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیے۔ کہ اگر اصل ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی۔ تو بہر حال اس کے قریب قریب پہونچ جائے۔ جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اسی قدر شعر زیادہ صاف۔ برجستہ۔ رواں۔ اور ڈھلا ہوا ہوگا۔ اور اردو میں جہاں تک ہمکو معلوم ہے یہ صفت میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

روزمرّہ اور محاورہ

جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کے بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتی ہیں۔ ان کو روزمرّہ کہتے ہیں۔ روزمرّہ اگرچہ

ایک جداگانہ وصف سمجھا جا ... ی کا
ایک فرد خاص ہے - یہ ظاہر ہے ... الفاظ زبان
پر آہیں گے - جو سادہ صاف اور سہل ... ر اگر ان میں کچھ
ثقل اور گرانی بھی ہو - تو رات دن کے بول ... ور کثرتِ استعمال سے
وہ منجھکر صاف ہو جاتے ہیں - روزمرّہ کے لئے فصیح ہونا لازم ہے -
میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرّہ اور محاورہ کا استعمال
پایا جاتا ہے - اور اس پر اُن کو ناز بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎
مرغانِ خوش الحانِ چمن بولیں کیا ... مر جاتے ہیں سُن کے روزمرّہ میرا

حُسنِ کلام

حُسنِ کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے - کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ
سے الفاظ استعمال کئے جائیں - لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے - اور
آواز کے مختلف اقسام ہیں - مہیب - پُر رعب - سخت - نرم - شیریں لطیف -
اِسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے
ہیں - بعض نرم اور شیریں - اور لطیف ہوتے ہیں - بعض سے جلالت اور
شان ٹپکتی ہے - بعض سے درد اور غمگینی ظاہر ہوتی ہے - اسی بنا پر
غزل میں سادہ - شیریں - سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں -
قصیدہ میں زوردار اور شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہے -
اِسی طرح رزم - بزم - مدح و ذم - فخر و ادّعا - وعظ و پند - ہر ایک کے لئے
جُدا جُدا الفاظ ہیں - شعرا میں سے جو اِس نکتہ سے آشنا ہیں - وہ اِن
مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں - اور یہ اُن کے کلام کی تاثیر کا بڑا زور ہے -

لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہیں۔ پا ہیں۔ لیکن ایک خاص ر
اُن پر چڑھ گیا ہے۔ کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ
اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام بجز ایک خاص رنگ
کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ ہے۔ کہ سعدی سے رزم اور
فردوسی سے بزم نہیں بن سکی۔

میر انیس صاحب نے رزم۔ بزم۔ فخر۔ ہجو۔ توصیف سب کچھ لکھا ہے
لیکن جہاں جس قسم کا موقع ہوتا ہے۔ اُسی قسم کے الفاظ اُن کے
قلم سے نکلتے ہیں۔ رزمیہ شعر لکھتے ہیں۔ تو فرماتے ہیں۔ ؎

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال و غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ ؎

کم بختا نہ ہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

کیا جانے کس نے روک دیا ہے ہر اک کو
سب دشت گونجتا ہے غضب ہے شیر کو

دیکھو ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں۔ جس طرح اُن سے شوکت ٹپکتی
غیظ و غضب ہے اُسی طرح الفاظ کی صوت و لہجہ سے بھی پیشتر
غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔

مولانا عبد الحلیم شرر عباسی

سنہ ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کے سن میں آپ کی بسم اللہ
ہوئی۔ آپ کے والد ماجد جناب حکیم تفضل حسین صاحب عربی کے اعلیٰ
تعلیم یافتہ اور فارسی کے یکتائے عصر تھے۔ واجد علی شاہ کے ملازم تھے۔
آٹھ برس کے سن میں آپ کو اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے۔ وہاں حافظ الٰہی بخش

ایک صاحب سے قرآن مجید ختم کیا۔ اور اپنے والد سے کچھ ابتدائی کتابیں اور ملّا باقر صاحب سے صرف و نحو۔ اور مولوی سیّد علی حیدر صاحب طبا طبائی سے کچھ منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ اسی زمانہ تعلیم میں انگریزی زبان بھی سیکھ لی۔ اور حکیم محمد مسیح صاحب سے طب پڑھی۔ اور چندے مطب بھی کیا۔ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں لکھنؤ آنا ہوتا تھا علم کا شوق بیکار نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں مولوی محمد یحییٰ صاحب اور مولوی عبد الباری صاحب سے متوسطات معقول تمام کیں۔ ۱۸۷۷ء میں آپ کے والد نے آپ کو لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں آکر آپ نے آفتاب ہند جناب مولانا عبد الحی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے تمام کتب درسیہ تمام کیں۔ اور جناب مفتی میر عباس صاحب سے عربی علم ادب کی تعلیم پائی۔ ۱۸۷۹ء میں علم حدیث کا شوق آپ کو دہلی لے گیا۔ اور مشہور محدث جناب مولوی نذیر حسین صاحب سے صحاح ستہ اور مؤطا امام مالک تفسیر جلالین ختم کرکے لکھنؤ واپس آئے۔ نظم میں آپ مولوی سیّد علی حیدر صاحب طبا طبائی کے شاگرد ہیں۔ جو اس زمانہ کے مشہور ناظم و نثار ہیں۔ حیدر آباد دکن میں قیام فرما ہیں۔ اور برکاتِ دولت آصفیہ سے مالا مال ہیں۔

۱۸۸۰ء میں آپ اودھ اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ آپ نے نکالا۔ جس میں بہت نازک رنگین شاعرانہ مذاق کے مضامین نکلتے رہے۔ اودھ اخبار کی اڈیٹری ترک کرنے کے بعد آپ نے ایک دلچسپ ناول لکھا جس کو بہت مقبولیت ہوئی۔ جنوری ۱۸۸۷ء سے آپ نے دلگداز جاری کیا۔ جو اپنے رنگ کا بے نظیر پرچہ ہے۔

۱۸۹۱ء میں آپ حیدرآباد تشریف لے گئے۔ نواب وقار الامرا بہادر معین المہام مال نے اپنے خزانۂ پائیگاہ سے ۱۵۰ روپیہ ماہوار آپکی تنخواہ مقرر فرمائی۔ حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں آپ نے تاریخ سندھ لکھی۔ جس کے مسودہ کو دیکھکر نواب وقار الامرا بہادر نے پانچ ہزار روپیہ انعام کے طور پر خزانۂ ریاست سے دلوائے۔ ۱۸۹۳ء میں آپ نواب وقار الامرا بہادر کے صاحبزادے نواب ولی الدین خان بہادر کے ہمراہ انگلستان تشریف لے گئے۔ انگلستان میں ۱ سال رہے۔ اور وہیں فرانسیسی زبان سیکھی۔ اور اتنا درک حاصل کر لیا۔ کہ فرنچ زبان کی کتابوں کو سمجھ لیں اور اُس زبان کی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کر لیں۔ انگلستان سے واپسی کے چھ ماہ بعد نواب وقار الامرا بہادر سے باضابطہ اجازت حاصل کرکے۔ پھر لکھنؤ آئے۔ اور یہاں آکر برابر علمی خدمات میں مشغول رہے۔

۱۸۹۵ء میں آپ پھر حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اور وہاں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں جناب مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم اور مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ کے ہمراہ آپ بھی اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ اُس وقت سے برابر لکھنؤ میں قیام ہے۔ اور علمی مشاغل سے کوئی دم خالی نہیں۔

نثر میں شاعرانہ خیالات کا اظہار کرنا۔ تاریخی اور عشقیہ ناولوں کو دلچسپ پیرایہ میں ادا کرنا۔ تاریخی حالات کو تحقیق سے لکھنا۔ قدرتی منظر۔ دلی جذبات کو ایسے طور پر لکھنا کہ پڑھنے والے کے دل پر اُس کا سچا اثر قائم ہوجائے۔ آپکا حصّہ ہے۔ جس میں اس وقت کوئی آپ کی برابری نہیں کرسکتا۔ ناولوں کی بابت تمام ہندوستان نے مان لیا ہے کہ آپ سے بہتر کوئی لکھنے والا نہیں۔ آپ کثیر التصانیف ہیں۔ آپ کی حسب ذیل چند تصانیف نہایت قابلِ قدر ہیں۔

تاریخ سندھ۔ عصر قدیم۔ فلورنڈا۔ ماہ ملک۔
ایّام عرب۔ فردوس بریں۔

خاموش آسمان

اے پیر فلک! تجھ میں کتنا بڑا ضبط اور تیرا کس بلا کا ظرف ہے تو خدا جانے کب سے تغیرات عالم کا تماشا دیکھ رہا ہے مگر زبان سے ایک حرف نہیں نکالتا۔ واقفیت حاصل کرنے میں تو اسقدر گرم ہے۔ اور ہمارے واقعات کا پتہ لگانے کی تجھے اسقدر دُھن لگی ہوئی ہے کہ دن کو اگر سورج کی روشنی تجھے ہمارا تماشا دکھاتی ہے تو رات کے اندھیرے میں ہماری کیفیت دریافت کرنے کے لیے تو اپنی مشعلیں روشن کر دیتا ہے۔ اور ہمارے یہاں کوئی بات نہیں ہوتی جسے دریافت نہ کر لیتا ہو لیکن یہ کیا قیامت ہے کہ تو سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے مگر کہتا کچھ نہیں تیری خموشی کا طلسم توڑنے کے لیے ہم نے تیرے کواکب پر غور کرتے کرتے اور اُن کے اثر دن کا تجربہ اُٹھاتے اُٹھاتے ہیئات اور نجوم کے سے مشہور فن پیدا کر دئے۔ اور تیری خموشی سے بھی بہت کچھ پوچھ لیا۔ مگر افسوس تیرے مُنہ سے آواز نہ نکلی۔ کاش تو اتنا ہی بتاتا کہ تیری ہی کیفیتوں سے اخذ کرکے ہم نے جو کچھ دریافت کیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ عبرت بین نگاہیں اکثر پرانی چیزوں کو صفحۂ عبرت خیال کرتی اور جن چیزوں نے قدامت کی مار کھائی ہے۔ اُن سے اگلوں کی سرگذشت پوچھتی ہیں۔ وہ اگلی پچھلی داستانیں سُننے کے لیے کبھی منہدم قصروں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ اور کبھی سنسان قبرستانوں کی طرف

اور سلف کے کارنامے کبھی وہ قدما کی یادگاروں سے دریافت کرنا چاہتی ہیں
اور کبھی اُن کی بوسیدہ ہڈیوں سے۔ گو یہ سب تیری طرح سے خاموش و
بے زبان ہیں۔ مگر متجسس نگاہوں کے سامنے عبرت و حسرت کا کوئی
نہ کوئی صفحہ ضرور پیش کر دیا کرتے ہیں۔ ہم جس طرح اگلوں کی ہڈیوں سے
اُس عہد عتیق کے واقعات دریافت کرتے ہیں اُسی طرح اپنی ہڈیوں کو
مرقع عبرت بنا کے اگلوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان ہڈیوں ہی پر موقوف
نہیں۔ ہم دنیا کی ہر دیرپا چیز سے پرانی سرگذشت پوچھتے اور اُسی کے
ذریعہ سے آنے والوں کے پاس اپنا پیام بھیجتے ہیں۔

مصر کے عالی شان اور سر بہ فلک اہرام خدا جانے کب سے یونہیں
سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ اور اے فلک خاموش! تیرے ساتھ نہ معلوم
کیسی سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ بے زبانی کی باتوں سے نہ کبھی تیرا جی
بھرتا ہے اور نہ وہ اُکتا کے سر ہٹاتے ہیں اُن کی معرفت ہمارے پاس
اگلوں کے بہت سے پیام پہنچے۔ اور ہم نے بھی آنے والوں کے لئے
اُنھیں اپنا معتبر قاصد قرار دے رکھا ہے۔

بونا پارٹ نے اُن کے قدم کے پاس کھڑے ہو کے کہا تھا "تم مدت ہائے
دراز سے یوں ہی خاموش کھڑے ہو۔ فراعنہ کے بیسیوں گھرانوں کا عروج
و زوال اور صدہا سلطنتوں کا ادبار و اقبال تمہاری نظر سے گذرا ہے
کل تم نے یہ دیکھا تھا کہ اسکندر اعظم اپنے گھوڑے پر سوار تمہارے قدم
کے پاس کھڑا ہوا ہے۔ اور آج اُسی شان سے مجھے دیکھ رہے ہو۔" یہ
کہہ کے اُس نے یقیناً درخواست کی ہو گی کہ "تم نے اپنی آنکھوں سے
جو کچھ دیکھا ہے بتاؤ۔ اور اگلوں نے تمہاری معرفت جو جو پیام بھیجے

ہوں پہونچا دو؟ اس کے جواب میں اہرام نے زبان سے تو کچھ نہ کہا ہوگا
مگر اس میں شک نہیں کہ اپنی خموشی اور بے زبانی کی زبان سے بہت
کچھ حالات کہہ دئے ہوں گے۔ اور نپولین نے انھیں عبرت کے کانوں
سے سن بھی لیا ہوگا۔

مگر بظاہر ہمیں اہرام کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ انسان اگر عبرت
کی آواز سن سکتا ہو اور خدا نے اُسے زبان حال سمجھنے کی لیاقت و قوت
عطا کی ہو تو اُسے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ قریب الانہدام
دیواروں سے سر ٹکرانا اور شکستہ قبروں کی ٹھوکریں کھانا فضول ہے۔
اس لئے کہ ہمارا سچا اور پرانا داستان گو اے آسمان! تو ہے۔ جو ہر وقت
ہماری نظر کے سامنے ہے۔ اگر تو بتانے پر آئے یا تیری صورت سے
اقتباس کرنے کی قوت ہو تو ہم کون سی اگلی بات ہے جسے نہیں معلوم کر سکتے۔

لیکن قیامت تو یہ ہے کہ اے خاموش آسمان! تو زبان حال سے بھی
کچھ نہیں کہتا۔ تیری وضع و قطع میں کبھی کوئی ایسا تغیر بھی نہیں ہوتا
جس سے کسی انقلاب کا پتہ لگ سکے۔ لوگ تجھے بوڑھا کہتے ہیں۔ اور
تو نے ہمارے وہم و خیال سے زیادہ اتنی بڑی عمر پائی ہے کہ اس کے
لحاظ سے تجھے بوڑھا کہنا غلط بھی نہیں۔ لیکن بچپن جوانی اور بڑھاپا
ایسی عمریں ہیں جن کے اعتبار سے ہر شخص اور ہر چیز میں کسی نہ کسی
قسم کا انقلاب ضرور ہوا کرتا ہے۔ بچپن میں ننھے ننھے ہاتھ پاؤں اور
چھوٹی سی سمجھ ہوتی ہے۔ جوانی میں توانا و تندرست اعضا اور شباب
کا زور شور ہوتا ہے۔ پھر بڑھاپے میں ہر چیز کا انحطاط ہوتا ہے۔
اور کمزوری و بے دست و پائی اپنا زور شور دکھاتی ہے۔ اے آسمان!

تو بوڑھا ہے تو چاہیے تھا کہ کبھی ہم نے تیری طفولیت اور تیرے شباب
کو بھی دیکھا ہوتا۔ ممکن ہے کہ نوع انسانی نے صرف تیرا بوڑھاپا ہی دیکھا
ہو۔ اور تیرا بچپن و شباب اس کی عمر اور اس کے ہوش و حواس سنبھالنے
سے پیشتر ہی گزر گیا ہو۔ لیکن آخر بڑھاپا بھی تو ہمیشہ ایک رنگ اور
ایک حالت پر نہیں رہتا۔ مگر تو نے کس بلا کی کاٹھی پائی ہے۔ یا کون سا
کشتہ کھایا ہے۔ کہ ہر چیز میں انقلاب ہے اور نہیں ہے تو تجھ میں۔
خیر! اے مکار آسمان! تو چاہے کیسی ہی متانت کی شان دکھائے
اور کتنے ہی بڑے ضبط سے کام لے مگر ہم تجھ سے تیری سرگذشت
پوچھینگے اور تو جواب دے یا نہ دے ہم تجھ سے قبولوا ہی کے چھوڑینگے
اور ایسی ایسی پتے کی باتیں کہیں گے کہ تجھ سے انکار کرتے ہی نہ بن
پڑے گی۔ کیا تو اس سے انکار کر سکتا ہے کہ کبھی تیرے نیلے سائبان
کے نیچے اور تیری ان رات کو کھلنے والی آنکھوں کے سامنے ہم نہ تھے
بلکہ ہر طرف یا پہاڑ میدان ریگ کے تودے اور یا درختوں کے گھنے
جنگل تھے جن میں ہوا کے سوا کوئی متحرک مخلوق نہ تھی۔ ہوا کبھی
آہستہ اور کبھی زور شور سے چلتی اور عجب ہنگامہ مچاتی تھی۔ پھر اس کے
بعد ایک وہ زمانہ تھا کہ جس طرف نظر اٹھا کے دیکھیے طرح طرح کے مہیب
اور عظیم الجثہ جانوروں کا شور و ہنگامہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمارا زمانہ
آیا اور ہمیں تو اس محنت و جانفشانی میں مشغول دیکھ رہا تھا کہ
جنگلوں کو کاٹ کاٹ کے زمین صاف کر رہے تھے۔ موذی جانوروں اور
وحشی درندوں کو مار مار کے اپنی نسل کے لئے امن و امان کی حکومت
قائم کر رہے تھے۔ کیا تو کہہ سکتا ہے کہ ان باتوں کو تو نے نہیں دیکھا؟

نہیں دیکھا ہے مگر عرش معلی کے قریب ہونے کے باعث مجھ میں یہ کہا ہوگا
کی ایسی قوت پیدا کی گئی ہے کہ قدرت کے بھیدوں کو افشا کرنے

سکندر کا تابوت

صاحبو! تم نے مشاعرے بہت دیکھے ہیں۔ اور بہت سے
بھی دیکھ ڈالے جن میں بڑے بڑے شعرا کو غزل سرائی کرتے
گرامی فصحا کو داد فصاحت دیتے دیکھا ہوگا۔ لیکن ایسی
انجمن کبھی نہ دیکھی ہوگی جیسی کہ سکندر کی موت کے وقت
کے گرد شہر بابل میں دیکھی گئی تھی۔

سکندر نے بڑے بڑے حکیم اور فلسفی مختلف ممالک سے
بلوا کے اپنی صحبت میں جمع کئے تھے۔ جن کی باتیں سننے
لطف آیا کرتا تھا۔ ان حکیموں میں یونان کے بھی تھے فارس
تھے اور ہندوستان کے بھی تھے۔

جب ہندوستان سے واپس جا کے وہ بابل میں مر گیا تو
دامن اور لشکر والوں میں رات بھر کہرام مچا رہا۔ صبح کو اس
مرصع تابوت تیار کر کے رکھ دیا گیا۔ اور سکندر اس میں
اس وقت تمام حکما تابوت کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے۔ اور
حسرت و اندوہ سے خاموش تھے کہ کسی حکیم نے نہایت ہی جوش
بڑھ کے تابوت پر ہاتھ رکھا اور کہا "آہ! جو بڑے بڑے
کو اسیر کر لیا کرتا تھا آج وہ خود اسیر ہے" اور اس کے

سے کہا "آپ سب صاحب بھی تابوت پر ہاتھ رکھ رکھ کے اپنے جذبات دلی کو ظاہر کریں۔ دیکھوں آپ کیا کہتے ہیں" یہ سنتے ہی سب حکیموں نے بڑھ بڑھ کے اور تابوت پر ہاتھ رکھ رکھ کے اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کر دیئے۔

ایک بولا "بادشاہ سونے چاندی کو اپنے صندوقوں میں بند کیا کرتا تھا۔ اور آج خود زرنگار صندوق (تابوت) میں بند ہے"

دوسرے نے بڑھ کے کہا "آہ! اس جسم نے کیسا دنیا کو چھوڑا اور اب تابوت میں جانے کی اسے کیسی جلدی تھی!"

تیسرا بولا "کیسی حیرت کی بات ہے کہ جو سب پر غالب تھا مغلوب ہوگیا اور جو ضعیف تھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اور پھولے نہیں سماتے"

چوتھے نے کہا "یہ وہ شخص ہے جس نے موت کے خیال کو تو تھمی رکھا۔ اور اپنی آرزوئیں عالم پر آشکارا کردیں۔ پھر موت کو کچھ دنوں اور کیوں نہ ٹالا کہ آرزوئیں بر آتیں؟ یا اپنی امیدوں کو اتنا مختصر ہی کیوں نہ رکھا کہ وہ موت کی دست برد سے بچ جاتیں؟"

پانچویں نے کہا۔ "او غم زدہ کوشش کرنے والے! تو نے وہ چیز جمع کی جس کی احتیاج رکھنے کے باعث تو ذلیل و خوار ہوا۔ پھر اُس کے بوجھ نے تیرے ساتھ بے وفائی کی۔ اور اُس کی تحصیل کے گناہوں کو تو نے کمایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تو نے جو کچھ پیدا کیا غیروں کیلئے تھا۔ اور اُس کا گناہ تیری ہی گردن پر ہے"

چھٹے نے کہا "تو ہمیں اکثر نصیحت کیا کرتا تھا مگر اس مرجانے سے زیادہ بلیغ نصیحت کبھی نہیں کی تھی۔ لہذا جو عقل رکھتا ہو سمجھے۔

اور جو چشم عبرت رکھتا ہو عبرت پکڑے۔"

ساتویں نے کہا "بہت سے ہیبت زدہ تجھ سے دور اور تیرے خوف سے کانپتے رہتے۔ اور آج وہ تیرے سامنے اور پاس کھڑے ہیں۔ اور تجھ سے نہیں ڈرتے"۔

آٹھویں نے کہا "بہت سے ایسے ہوں گے کہ جب تو تقریر کرتا ہوتا انھیں آرزو ہوتی کہ تو خاموش ہو جائے۔ آج انھیں کو تمنا ہے کہ کوئی لفظ تیری زبان سے سنیں اور تو خاموش ہے۔

نواں بولا "کتنوں نے اس غرض سے اپنی پیاری جانیں دیں کہ تو نہ مرے اور بچ جائے مگر آخر تو مر ہی گیا"۔

دسواں بولا "مجھے حکم تھا کہ آپ سے جدا نہ ہوں۔ اور آج کوئی تدبیر نہیں بن پڑتی کہ کیونکر آپ تک رسائی ہو۔

گیارہواں بولا "آج کا دن عظیم الشان دن ہے۔ اس کی جو مصیبتیں جا رہی تھیں پلٹ آئیں۔ اور اس کی جو برکتیں آ رہی تھیں واپس گئیں لہٰذا جس شخص کی سلطنت چھن گئی اُس پر جس کسی کو رونا ہو آکے روئے"

بارہواں بولا "اے صاحب جبروت! تیرا جبروت اس طرح دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا۔ جیسے بدلی کو ہوا اُڑا لے جاتی ہے۔ اور تیری سلطنت کے آثار یوں مٹ گئے جس طرح مکھی اُڑ جاتی ہے"۔

تیرہویں نے کہا "اے وہ شخص جسے ساری دنیا باوجود اس طول و عرض کے تنگ نظر آتی تھی اب بتا کہ اس گز بھر زمین پر جس پہ تیرا تابوت رکھا ہوا ہے تیرا کیا حال ہے۔"

چودھویں نے کہا "اُس شخص پر تعجب کرو جس کی یہ وضع و حالت ہو

دولت کے فراہم کرنے میں بڑی شہرت حاصل کی۔ مگر وہ دولت ہی کیا تھی۔ ایک حقیر یا ذرا سی مٹ جانے والی چیز۔ یا ایک پرانا بوسیدہ کھوکھل درخت "۔

پندرھواں بولا " لوگو اس چیز کی طرف رغبت نہ کرو جس کی مسرت ناپائدار ہو اور جس کی لذت جاتی رہتی ہو۔ آج تو تم پر کھل گیا کہ کون چیز مٹنے والی ہے؟ اور کون رہنے والی؟"

سولھواں تابوت پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "دیکھو اس سونے والے کا وقار کیسا تشریف لے گیا؟ اور بدلی کیسی چھنٹ گئی؟"

سترھویں نے قدم آگے بڑھا کے کہا " اے وہ شخص جس کا غصہ موت تھا۔ تجھے موت پر غصہ نہ آیا؟"

اٹھارھویں نے کہا " اس گذرے ہوئے بادشاہ کو تم نے دیکھا اب جو بادشاہ زندہ باقی ہے اسے دیکھ کے نصیحت پکڑے "۔

انیسویں نے کہا۔ " جس کی آواز پر خوشی سے کان لگے رہتے تھے آج وہ خود خاموش ہے۔ لہذا جو خاموش تھے اُن کے لئے موقع ہے کہ بولیں "۔

بیسویں نے کہا " عنقریب وہ بھی تجھ سے آملے گا جو تیری موت پر خوش ہوا ہے۔ جس طرح تو اس سے جا ملا جس کے مرنے کی تجھے خوشی تھی "

اکیسویں نے کہا " یہ کیا ہوا کہ اب تو کوئی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا۔ حالانکہ تو وہ ہے جس کی نظر میں ساری دنیا حقیر و ذلیل تھی۔ اور کیا ہوا کہ تو تنگی مکان سے نہیں گھبراتا۔ حالانکہ شہروں کی چار دیواری میں بھی تیرا دم گھٹتا تھا؟"

بائیسویں نے بڑھ کے کہا " دنیا کا یہ انجام ہے۔ اس لئے اسے

پہلے ہی سے چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔"

اب حکماء و فلسفی خاموش ہوئے تو سکندر کے داروغۂ باورچی خانہ نے آکے تابوت پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "دسترخوان بچھے ہوئے ہیں۔ اور کھانے چنے ہوئے ہیں۔ مگر سالارِ قوم کا پتہ نہیں۔"

اسکے بعد خزانچی نے آکے کہا۔ "مجھے دولت جمع کرکرکے رکھنے کا حکم تھا اب یہ دولت کس کے حوالے کروں ؟"

اتنے میں کسی اور شکستہ دل نے آکے کہا۔ "یہ ساری لمبی چوڑی زمین اب سمٹ کے سات بالشت کی رہ گئی۔ (جس پر تابوت رکھا ہوا ہے) اگر یہ انجام پہلے سے معلوم ہوتا تو اس کے اور چھور کا پتہ لگانے کے لئے تو گھر سے کیوں قدم باہر نکالتا ؟"

اب دارا کی بیٹی روشنک جو اسکی بی بی تھی بڑھ کے آئی اور بولی "تم سب نے جو کچھ کہا اس سے تعریض اور طعن و تشنیع کی بو آتی ہے۔ میں تو بس اتنا کہوں گی کہ مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ جس نے دارائے عجم کو مغلوب کیا۔ کبھی وہ خود بھی مغلوب ہوگا۔" پھر سب کی طرف دیکھ کے کہا "جو جام اس نے پیا اسے تمہارے لئے چھوڑ گیا ہے۔ لہٰذا اب اس کے بعد اسے تم سب بھر بھر کے پینا۔"

اس کے بعد جب سکندر کے مرنے کی خبر اس کی ماں کو پہونچی تو بولی "آہ ! میرا بیٹا تو دنیا سے چل بسا مگر اس کی یاد میرے دل سے نہیں مٹی۔"

کنج عزلت

دنیا کے جھگڑوں سے نجات پانے اور تمہاری تکلیفوں سے بچنے کے لئے کوئی مامن بھی ہے؟ جہاں ہم اطمینان سے بیٹھ سکیں۔ اور کوئی ہمیں نہ ستائے۔ فارغ البالی کی زندگی بسر کریں۔ اور کوئی ہمارے عیش کو بے مزہ نہ کرے۔ کسی فکر کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔ اور کسی تردد کی ہم تک رسائی نہ ہو۔ اگلے کہہ گئے ہیں۔ ع ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را لیکن وہ گوشۂ تنہائی کہاں ہے؟ ہم نے تو ہزار ڈھونڈھا کہیں نہ پایا۔ لاکھ سر مارا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر وہ کدھر ہے؟ کس سرزمین میں ہے؟ اور کس اقلیم میں واقع ہے؟ جہاں جاتے ہیں اور جس طرف نظر اٹھا کے دیکھتے ہیں اس سچے مامن اور حقیقی جائے پناہ کا سراغ نہیں لگتا۔ جہاں تک فکریں نہ پہونچنے پاتی ہوں۔ اور خیالات پریشان کی رسائی نہ ہوتی ہو۔

کیا وہ ظلمات میں ہے جہاں آب حیات ہے؟ جس کی تلاش میں لگے ہزار سرگرداں رہے مگر نہ پایا۔ جس کی جستجو میں بڑے بڑے سیاحوں نے دنیا کی خاک چھانی اور نہ پہونچ سکے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت خضر سکندر کو آب حیات کے چشمہ پر لے گئے۔ جام حیات پیا۔ اور چاہا کہ سکندر کو بھی پلائیں مگر اس چشمہ کے کنارے اس قدر جاندار زندگی کے ہاتھوں سے عاجز اور موت کے آرزومند دکھائی دیے کہ سکندر کو جینا بلائے جان نظر آیا۔ اور یہ خیال کر کے کہ ایسے جینے سے مرنا بہتر ہے۔ آبحیات کے پینے سے انکار کر دیا۔ مگر خضر نے سیر ہو کے پیا۔ جس کے

پینتے ہی وہ موت سے آزاد اور ملک الموت کی پہونچ سے باہر ہوگئے۔ مگر
ناکام و نامراد اسکندر جس نے بہادری کے ساتھ زندگی و موت کی کشمکش
میں پڑنا گوارا کر لیا تھا ٹھکروں کا ناقابل برداشت بوجھ اپنے سر پہ
لادے ہوئے واپس آیا۔ اس سے بحث نہیں کہ دونوں میں سے کون
اچھا رہا۔ مگر بظاہر ہمیں تو دونوں برابر نظر آتے ہیں۔ آج ہماری
آنکھوں کے سامنے نہ خضر ہی موجود ہیں اور نہ اسکندر۔ خضر نے اگر
آب حیات پی کے ابدی زندگی حاصل کی تو سکندر کو بھی اُس کے کارناموں
نے آج تک مرنے نہیں دیا۔ دونوں کے نام رہتی دنیا تک رہیں گے۔
اور کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ موت و زندگی نے اُن کے جسموں
کے ساتھ جو سلوک چاہے کیا ہو مگر اُن کے ناموں پر موت کا زور
بالکل نہیں چل سکا۔ چنانچہ زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہینگے
یہ مانا کہ سکندر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور خضر موجود سمجھے جاتے ہیں
مگر خضر و سکندر میں اصلی فرق زندگی اور موت کے لحاظ سے نہیں
بلکہ ایک دوسری حیثیت سے ہے۔ سکندر نے چاہے خضر کے آب حیات کو
نہ پیا ہو مگر اُسے آب حیات کا ایک دوسرا چشمہ مل گیا۔ جس کی وجہ
سے اُس نے بھی ابدی و سرمدی زندگی حاصل کر لی۔ مگر جو چیز خضر کو
ملی اور سکندر کو نہ مل سکی وہ کنج عزلت یا گوشۂ تنہائی ہے۔ بدنصیب
سکندر کو وہ کنج عزلت نہیں مل سکا۔ حسرتوں اور آرزوں۔ ہوسوں
اور تمناؤں کا ایک بار عظیم سر پہ لئے ہوئے وہ چاروں طرف پھرا۔
اور کہیں وہ خموشی اور بے فکری کا مامن نہ مل سکا۔ جہاں اپنے سر
کے بوجھ کو پھینک کے وہ بے پروائی اور آرام کی زندگی بسر کرتا۔

لاکھ سر مارا مگر کچھ زور نہ چلا - اور آخر اُسی بوجھ کے دباؤ سے بیمار
پڑ کے بابل میں مر گیا -
مگر خضر کو وہ گوشۂ عزلت مل گیا جہاں نہایت اطمینان سے بیٹھے
ہیں کوئی فکر پاس نہیں پھٹکنے پاتی - کسی آفت کا سامنا نہیں ہوتا - کوئی
خطرہ دل میں نہیں آتا - اور کوئی سودا دماغ میں نہیں سماتا - دنیا میں
ہیں مگر کوئی اُن تک پہونچ نہیں سکتا - زندہ ہیں مگر زندگی کی تلخیوں
سے آزاد ایک کونے میں خاموش و بے غرض بیٹھے ہیں - اور دنیا کے
تغیرات ایک دائمی تھیٹر بن کے آنکھیں روز ایک نیا تماشا دکھاتے اور
اور عالم تخلیق کے ایکٹر ہر لحظہ اُن کے سامنے نیا کھیل کھیلتے ہیں بچوں
کی اُس کھیل کی طرح جس میں شیشہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہر گھڑی
پہلا نقشہ بگاڑتے اور نیا بناتے ہیں - دنیا کا جغرافیہ روز بدلتا ہے
پل پل میں پرانا کارخانہ غائب اور نیا قائم ہوتا ہے - ہر روز ایک نیا
بہادر میدان میں آ کے جوہر شجاعت دکھاتا - ہزاروں اور لاکھوں
نبرد آزماؤں کو مغلوب کرتا - شہرت و ناموری حاصل کرتا - اور خاک میں
مل جاتا ہے - بڑے بڑے متبحر عالم و فاضل حاذق طبیب و معالج
کامل فن صناع و مہندس ناموری کے اسٹیج پر آتے اور اپنے کمالات و ہنر
دکھانے کے بعد نہایت ہی حسرت و ناکامی کے ساتھ دوسروں کے لئے
جگہ چھوڑ کے چلے جاتے ہیں - گم نام اور کم مایہ فلک عروج پکڑتے - دولت
و حشمت میں نمود حاصل کرتے - اور پھر ذلت میں پڑ جاتے ہیں - سلطنتیں
بنتی اور بگڑتی ہیں - اور قومیں ناموری کے ملاء اعلیٰ پر پہونچ کے گرتی
اور حقیقی ادبار کے تحت الثریٰ میں پہونچ جاتی ہیں - ان تمام انقلابات

عالم سے سب متاثر ہوتے ہنستے اور روتے۔ خوشیاں مناتے اور مبتلائے
الم ہوتے ہیں۔ مگر اکیلا ایک شخص اپنے خاموشی کے گوشۂ عزلت سے ان
چیزوں کا تماشا دیکھتا اور لطف اُٹھاتا ہے۔ وہ کون ہے؟۔ حضرت خضر۔
شعرا اُن پہ چاہے جیسی آڑی ترچھی آئیں۔ آج کل کے انگریزی داں
چاہے اُن کی زندگی سے انکار ہی کیوں نہ کریں۔ مگر اُنھیں پروا نہیں
ہماری طرح ناتجربہ کار ہوتے تو لوگوں کے تاننے اور شاعروں کے چھیڑنے سے
کبھی نہ کبھی برافروختہ ہوکے اپنے کنج عزلت سے باہر نکل آتے۔ مگر
نہیں اُن پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ پرواہ ہی نہیں کرتے کہ دنیا
والے اُن کی نسبت کیا کہتے ہیں۔

خضر نے سکندر کو آب حیات کے چشمہ تک پہونچا دیا مگر اپنا وہ عزلت
کدہ اور حوادث روزگار سے بچنے کا مامن نہ دکھایا کہ اُسے جینے میں مزہ
آنے کی اُمید ہوتی۔ اور یہ اندیشہ نہ پیدا ہوتا کہ زندگی عذاب ہوجائیگی
اُسے اگر خضر کا وہ مامن مل جاتا تو پھر وہ بڑھاپے کی بے دست و پائی
کا ذرا بھی خیال نہ کرتا۔ اور ہوس ملک گیری سے بھی دست بردار
ہوجاتا۔

سچ یہ ہے کہ دنیا میں کنج عزلت ہی وہ زبردست قلعہ ہے جہاں تک حوادث
روزگار کی رسائی نہیں ہوتی۔ اور دست برد زمانہ جس کا کچھ بگاڑ نہیں
سکتی۔ بڑی بڑی سلطنتوں اور بڑے بڑے فاتحوں نے دنیا میں سیکڑوں
ایسے مضبوط اور زبردست قلعہ بنائے ہیں جن پر لوگوں کو بڑے دعوے
تھے۔ بابل و نینوا کے ایسے قدیم شہروں سے زیادہ محفوظ اور بھروسے کے
شہر اور قلعہ کون ہوں گے؟ مگر زمانے کے بے روک ہاتھوں نے سب کو

مٹا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل کے قلعے پرانے قلعوں سے زیادہ محفوظ
اور ناقابل گزر ہوتے ہیں۔ جن کے قریب تک بھی دشمن کا گزر نہیں ہوسکتا
مگر اس میں بھی کسی کو شک نہ ہوگا کہ زمانے کا دستِ ستم کبھی نہ کبھی
اُن کو مسمار کرہی دیگا۔ اور آفات ارضی وسماوی کی فوجیں اور مرور
ایام کے حملہ آور اُنھیں مٹا کے رہیں گے۔

لیکن کُنجِ تنہائی کے سیدھے سادے اور بے تکلف قلعہ تک نہ کوئی دنیا
کا زبردست سے زبردست فاتح پہونچ سکتا ہے۔ اور نہ ان قدرتی حملہ آوروں
کی رسائی ہوسکتی ہے جو دنیا کی ہر چیز کے مٹانے پر تیار رہا کرتے ہیں۔
فلک بے مہر کے ستم ساری دنیا پر ہوتے ہیں مگر اس گوشۂ عزلت تک
اُس کا ہاتھ بھی نہیں پہونچ سکتا۔

الغرض کنجِ عزلت ہی وہ مقام ہے جہاں ہم ہر قسم کے آزار اور
ہر طرح کے آلام و حوادث سے نجات پاسکتے ہیں۔ مگر افسوس اُس کا پتہ
نہیں۔ اور نہ کوئی پتہ دینے والا ہے۔ خضر نے سکندر کے ایسے نامی
دوست کو آبِ حیات کا چشمہ بتادیا مگر اُس گوشۂ عزلت کا پتہ نہ دیا
جہاں وہ کمال فارغ البالی کی زندگی بسر کررہے ہیں تو بھلا ہمیں یا
کسی اور کو کیا پتہ دینگے؟ بعض بعض بزرگوں سے کبھی کبھی خضر سے
ملاقات بھی ہوجایا کرتی ہے۔ مگر افسوس ہمیں کہیں نہ ملے۔ ورنہ اُن سے
پوچھتے اور التجا کرتے کہ کبھی ہمیں بھی اپنے سچے عشرت کدے کی سیر
کرادیجئے۔ دیکھیں تو سہی وہاں کیا ہے اور کیسے کیسے سامانِ عیش مہیا
ہیں۔ کہ کسی قسم کی فکر پاس نہیں پھٹکنے پاتی اور آلام و ہموم دور ہی
دور رہتے ہیں۔

لیکن ایسا نہیں ہے جس گوشۂ عزلت میں افکار و آلام سے نجات ملتی ہے وہاں کچھ ہی نہیں۔ نہ کوئی عیش کا سامان ہے۔ نہ کسی قسم کی دلچسپیوں کے کھیل ہیں۔ نہ ہمارے مذاق کا ولایتی فرنیچر ہے نہ جدید آلات و ذرائع عیش ہیں جو سائنس کے معجزات سے ان دنوں پیدا ہو گئے ہیں۔ وہاں جو کچھ لذت و مسرت ہے اسی بات کی ہے کہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ وہاں پہونچنے کے بعد شک پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم بھی ہیں یا نہیں۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کنج عزلت کہیں گور غریباں کے پاس ہوگا۔ بیشک یہ خوابگاہ عدم کے مست خواب جس بے فکری کے ساتھ قیامت سے شرط باندھ کے لیٹے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کنج عزلت میں پہونچ گئے ہیں۔ جہاں خاموش لیٹے ہیں۔ نہ کسی سے بولتے ہیں نہ چالتے ہیں۔ اور یہاں تک بے پروا ہیں کہ زمانہ خود ان کے جسم کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے برا نہیں مانتے۔ گوشت سڑ کے خاک ہو چکا تو پروا نہیں۔ ہڈیاں گل کے مٹی میں مل جائیں تو فکر نہیں۔ ہم دو ہزار مرتبہ کسی محشر خرام کی ٹھوکر سے مر کے زندہ ہوئے مگر یہ کسی کی نہیں سنتے ان پر نہ کسی کے لب جان بخش کی مسیحائی چلتی ہے اور نہ انہیں کسی شوخ ادا کی قیامت خرامیاں جگاتی ہیں۔ جس رخ پہ لیٹ گئے لیٹ گئے پھر کروٹ بھی نہیں بدلتے۔ یقیناً وہ کنج عزلت میں پہونچ گئے ہیں اور وہ لطف اٹھا رہے ہیں جس کے جان دینے پر بھی نصیب ہونے کی ہمیں امید نہیں۔

لیکن نہیں سنتے ہیں کہ ان خاموشانِ ازل کو بھی قیامت کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ چاہے ہم سے نہ بولیں۔ ہماری بات کا جواب نہ دیں۔ اور

اس کے روادار نہ ہوں کہ ان کی خاموشی کی لذت کسی اور کو بھی نصیب ہوسکے۔ مگر زندگی تا بعد الموت کے جھگڑوں اور ثواب و عذاب کے اندیشوں سے نہایت پریشان و متردد ہیں۔ کھٹکا لگا ہوا ہے کہ دیکھئے آئندہ کیا ہوگا۔ اور روزِ جزا میں کیسی پیش آئے گی۔ افسوس وہ گوشۂ عزلت جہاں فکروں اور خطروں کا گذر نہ ہو یہاں بھی نہیں ملا۔

تو اُسے کہاں ڈھونڈھیں؟ کیا مایوس ہوکے بیٹھ رہیں؟ مگر ہمارے فکریں اور روز روز کے آلام و حوادث بیٹھنے بھی تو نہیں دیتے۔ جب کسی آفت کا سامنا ہوتا ہے یہی جی چاہتا ہے کہ وہ کنجِ عزلت ملجاتا جہاں پہونچتے ہی دروازہ بند کرکے بیٹھ رہتے۔ اور اس آفت سے نجات ملجاتی اور جس گھڑی مصیبت سر پر آکے پڑ جاتی ہے دل کا تقاضا شروع ہوتا ہے کہ اسی گوشۂ تنہائی کو ڈھونڈھ نکالو جہاں حضرتِ خضر مسرت و آرام اور اطمینان و امن و امان کے ساتھ جاکے بیٹھ رہے ہیں۔

جس طرح کیمیا کے متعلق ہزاروں آدمیوں پر شبہ ہوتا ہے۔ اور پھر بھی پتہ نہیں چلتا کہ اُس کا نسخہ کسے معلوم ہے۔ اسی طرح ہمیں ہر گروہ اور ہر شخص پر دھوکا ہوتا ہے کہ اُنسے گوشۂ عزلت کا راستہ معلوم ہوگا۔ لیکن جستجو کے بعد کوئی ایسا نہیں ملا جو اُدھر کا راستہ بتائے اور ہم راہِ نجات کے مسافرین کے وہاں پہونچیں۔

زیادہ تر گمان تارک الدنیا لوگوں اور علماے روحانیین پر ہے کہ انھیں اس منزلِ نجات کا سراغ لگ گیا ہے۔ اس لئے کہ انھیں جیسا اطمینان قلب حاصل ہے۔ اور سامانِ دنیوی کو یہ جیسی بے پروائی اور کمال استغنا کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کسی کو نہیں دیکھا۔ گو ان میں

بھی بہت سے ایسے دنیا پرست ہیں جن کے دل میں ہمارے دلوں سے زیادہ ہوسیں بھری ہوئی ہیں۔ مگر انھیں کی وضع میں چند ایسے سچے بہادر سورما بھی ہیں جنھوں نے نفس کشی اور جہاد نفسانی کے ذریعہ سے گنج عزلت کے زبردست قلعہ کا پتہ لگا کے اُسے فتح کر لیا ہے۔ کاش اُن تک ہماری رسائی ہوتی۔ اور اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کے ہم التجا کرتے کہ ہمیں بھی وہیں پہونچا دیجئے جہاں آپ ہیں۔ لیکن قیامت تو یہ ہے کہ جو اطمینان قلب کے سچے عزلت کدے میں پہونچ گیا اُسے ساری دنیا سے نفرت ہوگئی۔ ہم اُسے ہزار تلاش کریں وہ ہم سے دور ہی دور رہتا اور ہماری صورت دیکھ کے بھاگتا ہے۔

لیکن جب اور سب راستے بند ہیں تو ہمیں ایسے ہی فاتح گنج عزلت کا انتظار کرنا چاہئے شاید کہیں ملجائے۔ ہماری التجائیں اُس کے دل پر اثر کریں۔ اور وہ ہمیں اُس حقیقی امن میں پہونچا دے۔ گوشۂ تنہائی کے ملنے کی اگر کوئی سبیل ہے تو بس یہی ہے۔ اور اتنا سہارا بھی ہمیں زندگی بسر کر دینے کے لئے کافی ہے۔

فیروز کوہ کی گھاٹیاں

جنوں آمادۂ عشق بتاں پویند می ماند بصحرا یا بوادی یا بکوئے یا بہ بازارے

۱۹۵۶ء کے موسم بہار میں علاقۂ غور کے مشہور پہاڑ فیروز کوہ کی گھاٹیاں اور وادیاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ سرسبز اونچے پہاڑ۔ (جو بارھوں مہینے مخمل سبز کے بہشتی حلّے پہنے رہتے ہیں) آسمان کی طرف سر اُٹھائے گویا خدا کی مہربانیوں اور قدرت کی فیاضیوں کا شکر ادا

کر رہے ہیں۔ صدہا چشمے اور آبشار جو اُن سرکش خود پرستان باغ حُسن کے سبز دامنوں میں چٹکی کا لہریا بناتے ہوئے نیچے تک چلے آئے ہیں۔ اُن کی معشوقانہ دلفریبی و دلکشی میں جان ڈال رہے ہیں۔ اونچی نیچی وادیاں جو اِن قدرتی معشوقان سبز پوش کے آغوش شوق بنی ہوئی ہیں۔ یہ مستان عشق کو اسی طرح اپنی طرف بلاتی اور کھینچتی ہیں جس طرح قصۂ حاتم طائی کے کوہ ندا کی صدائے یا اخی لوگوں کو بیتاب کرکے اپنے پاس بلاتی تھی۔ موسم کی رنگین طبعی نے انھیں پھولوں کا ایسا رنگ برنگ زیور پہنا دیا ہے کہ کوہستان بدخشاں کے بلبل ہزار داستان وطن کو خیرباد کہہ کے انھیں وادیوں میں آ بسے ہیں۔ اور جبکہ نہریں اپنے رقص کا تماشہ دکھاتے وقت جوش میں آ آ کے بلند آواز میں نغمۂ شور عشق گاتی ہیں تو وہ بھی اپنے معشوقوں یعنی شاہدان چمن کے پہلو میں بیٹھ کے اپنے راز و نیاز کی داستان چھیڑ دیتے ہیں۔ ایک پُر لطف و پُر فضا سبزہ زار انھیں پہاڑیوں کے آغوش میں پچاس ساٹھ میل تک مہ جبینوں کی زلف برہم کی طرح پیچیدگیوں اور خم و پیچ کا تماشا دکھاتا اور اپنی رعنائی پر ناز کرنے والے پہاڑیوں کے پہلو میں چھلی چھلیا کھیلتا چلا گیا ہے۔

سامنے خاص فیروز کوہ کی چوٹی پر وہ زبردست اور عالی شان قلعہ ہے جو دولت غوریہ کا مرکز ہے۔ جس نے دو ہی چار برس ہوئے دولت غزنویہ کا چراغ گل کیا ہے۔ اور ہندوستان کی دولت و حشمت لوٹ کے وہاں کے سونے کی طلائی کلس اپنے برجوں پر نصب کرائے ہیں۔ جو آفتاب کی کرنوں میں ضو دے دے کے غوری خاندان کے

عروج و اقبال کے ستارے بن گئے ہیں۔ اور عجب آن بان سے چمک رہے ہیں۔

اس وادی میں ہزارہا جانور ہرن اور چکارے۔ نیل گائیں۔ اور بارہ سنگھے بکمال آزادی و بے خطری سے چرتے اور آبشاروں میں پانی پیتے ہیں۔ نغمہ سنج اور نظر فریب رنگوں کے طیور شاداب و شگفتہ جھاڑیوں پر بے کھٹکے اور بے خوف بیٹھ کے چہکتے اور اِدھر اُدھر اُڑتے پھرتے ہیں۔ چرند و پرند کی یہ آزادیاں کہہ رہی ہیں کہ گویا انسان کا یہاں کبھی گذر ہی نہیں ہوا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ وادی خاص فیروز کوہ کے دامن میں ہے۔ جہاں آج کل اقبال مندی کا طوطی بول رہا ہے۔ اور سلطان ابوالفتح غیاث الدین محمد سام غوری کا دور دورہ ہے۔ جس کی بدولت ان پہاڑوں کا کوئی کنج اور اس سر زمین کا کوئی چپہ نہیں جدھر سے ہر مہینے میں ہزاروں تیر آزما اور بانکے ترچھے جوان گزر نہ جاتے ہوں۔ پھر ان وحشی جانوروں میں یہ آزادی و بے خطری کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس وادی کو جو پچاس ساٹھ میل تک پہاڑوں کے اندر ہی اندر لہراتی اور معشوقانہ مست خرامی کی شان دکھاتی چلی گئی ہے۔ سلطان نے خاص اپنے لئے ایک نزہت بخش تفریح گاہ اور اپنی مشق سپہ گری کے لئے ایک حوصلہ افزا شکار گاہ بنا رکھا ہے۔ قطعی ممانعت ہے کہ کوئی شخص ان پہاڑوں کے دامن میں شکار نہ کھیلے۔ اور اگر کسی نے بھی کسی جانور کو تیر کا نشانہ بنا دیا تو جان سے مارا جائے گا۔ لہذا کسی کی مجال نہیں کہ کسی طائر یا وحشی چوپائے کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھ سکے۔ چنانچہ اسی شاہی فرمان کی برکت ہے کہ اس دلچسپ مرغزار اور روح افزا وادی میں شکاری اور

شکار باہم ایسے مانوس رہتے ہیں کہ گویا شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں
اور دوست دشمن شیر و شکر بنے ہوئے ہیں۔ ہرنیاں کبھی کسی مقام پر
ٹھہر کے کسی کی نشیلی آنکھوں کی تصویر دکھاتی ہیں۔ اور کبھی دشت و وادی
میں چوکڑیاں بھر کے کسی کی شوخ ادائی اور کسی مست ناز کے چنچل پن
کا سماں پیش نظر کر دیتی ہیں۔

ناگہاں ایک خوبصورت ہرنی ایک پہاڑ کے نشیبی دامن سے ایسی
بدحواسی کے ساتھ جس کی اس امن و امان کے مقام میں امید نہیں
کی جاسکتی تھی بھاگتی اور چوکڑیاں بھرتی نکلی۔ وہ مسطح میدان کا زیادہ
حصہ نہیں طے کرنے پائی تھی کہ تین جادو نگاہ مہ طلعتیں پہاڑی گھوڑوں
پر سوار اور سر سے پاؤں تک جواہرات میں لدی ہوئی نمودار ہوئیں۔
تیر و کمان اُن کے ہاتھوں میں ہیں۔ زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی ہیں
اور نوجوانی و شباب کے پروں سے اُڑتی ہوئی تیز چنگال شاہینوں
کی طرح اُس ہرنی کے پیچھے گھوڑے ڈالے چلی آتی ہیں۔

(از ماہ ملک)

چاندنی رات سنسان میدان اور ایک سوار

ابتدائے سرما کی رات ہے اور خزاں کا موسم ہے۔ دو گھنٹے سے زیادہ
رات نہ آئی ہوگی۔ تارے کھلے ہوئے اور تین روز کا چاند۔ آسمان کے
مغربی کونے سے ذرا بلندی پر چمک رہا ہے۔ ہم جس مقام کا حال بیان
کر رہے ہیں وہاں اس وقت عجب کیفیت ہے۔ مغرب کی طرف چندھر
چاند کا گورا چہرہ نظر آرہا ہے اُدھر سفید بالو کے سیکڑوں ٹیلے چھوٹی

چھوٹی پہاڑیوں کی طرح کوسوں پھیلتے چلے گئے ہیں۔ جہاں یہ ناہموار ٹیلے نہیں ہیں وہاں بھی قدرت نے سفید رنگ کی اُجلی چادر بچھاوی ہے جو ہر وقت بچھی رہتی ہے۔ اور کبھی نہیں میلی ہوتی۔ خصوص اس وقت چاند کی دھیمی روشنی میں یہ قدرتی نیچر کے ہاتھ کا دھویا ہوا فرش کچھ ایسے روپ پر ہے کہ دیکھتے ہی دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ سوا مغرب کے اور سب طرف سنگستان پہاڑیاں باہم مل ایک دوسرے سے اُلجھی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ اِن پہاڑیوں میں اکثر تو ایسی ہیں جن پر روئیدگی نے نظر فریب مخملی فرش بچھا دیا ہے اور بڑے بڑے درخت جنھیں فصل خزاں ہنوز بالکل برہنہ نہیں کر سکی ہے۔ اپنی پنجۂ هروه اور بے لوب ٹہنیاں آزاد جنگلی طیور کے شب بسر کرنے کے لئے پھیلائے ہوئے ہیں۔

بعض پہاڑیاں اپنی سیاہ ڈراونی صورت سے اس سنسان سین میں مسافروں کے لئے وحشتناک نمونہ دکھا رہی ہیں۔ جن پر ہوا نے سوکھے اور سکڑے خشک پتے لا لا کے بچھا دئے ہیں۔ اس موسم کی ہوا معمولاً تیز چلتی ہے۔ اور اُس کی خاصیت ہے کہ ہر چیز پر ایک افسردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی ہوا کے جھونکے بڑے زور شور سے اونچے اونچے قلّوں سے ٹکراتے ہیں۔ افسردگی کے آثار تو رات کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ہاں سوکھے پتوں کی کھڑکھڑانے کے باعث ہر طرف سے سخت آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اور کوہستانی دروں اور قلّوں کے سین میں گونج اُٹھتی ہیں۔

ایسے وحشت انگیز مقاموں میں خصوص اس وقت بالکل سناٹا ہونا

چاہئے - لیکن نہیں مغرب و جنوب کے کونے کی طرف سے ٹاپوں کے کھڑ
کھڑانے کی آواز معمول سے زیادہ سنائی دیتی ہے - اور چند منٹ کے
بعد ایک سوار نظر آتا ہے جو ایک بہت نیچی گھاٹی کی راہ سے سرپٹ
گھوڑا دوڑاتا چلا آرہا ہے - گھاٹی میں جابجا خشک چشموں کے آثار
پائے جاتے ہیں - کیونکہ اُن کے بہاؤ کی جگہ پر بہت سی بالو جمع ہوگئی ہے
اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ سوار اپنی معمولی تیز روی سے گھوڑا
بڑھائے چلا آتا ہے - ٹاپوں کی کھڑکھڑانے کی آواز آتے آتے بعض
اوقات رک جاتی ہے اور وہی سکوت پیدا ہوجاتا ہے جو اُس مقام کے
شایاں ہے - آخر سوار اُس چشمے کو طے کر آیا جس میں گھٹنوں گھٹنوں
پانی ہے - اور بہاؤ کے رخ نشیب پاکر تیزی سے بہ رہا ہے - چشمہ
یہاں سے تھوڑی دور پر انہیں پہاڑیوں سے نکلا ہے - اور بہت
سی وادیوں اور چھوٹی چھوٹی نہروں کو لیتا ہوا جنوب کی طرف دور
پہونچکر نہر المقطع (دریائے کسون) میں ملگیا ہے - اور کیفون (کیفہ) کے
پاس بحیرۂ روم میں گرا ہے - سوار نے یہ نہر بھی طے کی - اس کے بعد کچھ
دیر ٹھہر گیا - اور پھر خدا جانے کیا دل میں آئی کہ اپنے سامنے والے پہاڑ
پر جو جانب مشرق واقع تھا چڑھنے لگا -

اگرچہ چاندنی کی کم کم اور کہرے کے باعث ماند پڑ جانے والی روشنی اسی
پہلو پر پڑتی تھی مگر گھوڑے کا پہچانا نہایت دشوار تھا - سوار کی
طبیعت میں خدا جانے کس قیامت کی ضد اور ہٹ تھی کہ گھوڑے
کے پہاڑ پر چڑھ جانے کی دقتوں کو بالکل خیال میں نہ لایا - اور
حتی الامکان بالکل صاف اور سیدھا راستہ دیکھ کر اوپر چڑھنے لگا

تھوڑی دیر میں اتنی بلندی پر پہونچ گیا کہ پلٹ کر دیکھا تو نظر بہت دور تک کام کرتی تھی۔ کوہ کارل کی سفید چٹانیں تو کہرے اور برف باری کی وجہ سے نظر نہیں آتی تہیں۔ ہاں وہ سفید ٹیلے اور میدان البتہ دکھائی دیتے تھے جن پر ریگ نے چاندی کے بھرنگ فرش بچھا دیا ہے۔ پہاڑ کی بلندی پر پہونچ کے سوار نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر آواز کو جو کسی طرف سے آجاتی ہے وہ غور سے سنتا ہے۔ مگر کسی قسم کی آواز نہیں سنی گئی۔ وہ گھوڑے سے اترا۔ اس کی گردن پر پیار سے تھپکیاں دیں اور دیر تک اس کے بال برابر کرتا رہا۔ ناگہاں کسی طرف سے ایک چیخ کی آواز آئی۔

(از ملک العزیز اور ورجنا)

منازل حیات

یہ مضمون مولوی عبد الرشید صاحب دہلوی کے ایک ناول منازل السائرہ سے لیا گیا ہے۔ مولوی عبد الرشید صاحب شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم دہلوی کے بھائی نہایت قابل اہل زبان ہیں۔ آپ نے یہ ناول عورتوں کی تعلیم کے لئے لکھا ہے۔ جیسا کہ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے توبۃ النصوح وغیرہ لکھی ہے۔ اس کی زبان نہایت پیاری ہے۔ خیالات نہایت پاکیزہ۔ جس سے اخلاق پر عمدہ اثر پڑسکتا ہے۔ اس ناول میں انسان کی عمر کے چار زمانوں کے حالات کا سچا فوٹو ایک مقام پر دکھلایا ہے۔ وہ مضمون یہاں منتخب کیا جاتا ہے۔

گلزارِ شیر خوارگی

یہ ایک چھوٹا سا مگر خوشنما و شاداب باغیچہ تھا۔ مختلف عمروں کے آدمی مرد اور عورتیں بادِ بہاری کا لطف اٹھاتے پھر رہے تھے۔ صبح سعادت کا وقت تھا۔ گلہائے رنگیں کی پیاری صورتوں نے زمینِ چمن کو بوقلموں کر رکھا تھا۔ شبنم نے موتیوں کے ہار بچھا دئے تھے۔ بادِ صبا فرحت و انبساط کے مژدے دیتی پھر رہی تھی۔ عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ مرد جوق جوق ہاتھ میں ہاتھ دے ہنستے بولتے۔ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اُمیدوں نے اُن کے چہرے مالا مال اور دل چونچال کر رکھے تھے۔ ہرے بھرے گلزار آنکھوں کے سامنے لہلہا رہے تھے۔ اور ماؤں کے قدرتی چشمے کشتِ اُمید کو تر و تازہ کر رہے تھے۔ انتہائے نظر اور حدِّ خیال تک چپّہ چپّہ اور ذرّہ ذرّہ شاداب دکھائی دیتا تھا۔ وسطِ چمن میں ایک دودھ کی نہر لہریں لے رہی تھی۔ کیا بے فکری کا زمانہ تھا! مسافر! وہی چھوٹے چھوٹے بچّے۔ بھوک لگی کنارے پر آئے۔ منہ جھکایا۔ اور سیر ہو گئے۔ ہائے۔ کیا نعمت تھی! کہ کلیجے سے لگا کر دنیا بھر کی کلفت دُور ہو جاتی تھی۔ افکار و ملال خواب و خیال ہو جاتے تھے۔ رنج و غم غلط ہو جاتا تھا۔ کیا دولت تھی! جس کے مقابل ہفت اقلیم کی سلطنت ہیچ و بے وقعت تھی۔ بادشاہ وقت کا حکم اتنا نامناسب تھا۔ کہ ہر شخص مسافر نوازی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس خدمت سے محروم رہ جاتا تو اپنے تئیں نہایت بد قسمت تصوّر کرتا۔ کیا مبارک سرزمین تھی! جو مرد نظر آیا شگفتہ۔ جو عورت دکھائی دی۔ وہ باغ باغ عورتوں کے پرے کے پرے جس وقت مسافر کو گود

میں لے کر گلگشت کو نکلتے تھے۔ درختوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔

یہ محافظ و خبرگیر جو مسافروں کی خدمت پر متعین تھے۔ ایسے اچھے لوگ تھے۔ کہ سَو طرح سے نثار تھے۔ ذرا مسافر کی پھانس لگی۔ اور بے چین ہوئے ان لوگوں کی پیشانیاں ستارہ صبح کی طرح روشن تھیں۔ اور اُن کے دل برکت نور سے معمور۔ محبت کا سرمہ اُن کی آنکھوں میں لگا ہوا تھا۔ اور خدمتگزاری کی روشنی اُن کے چہروں پہ چمک رہی تھی۔ مکر کا نام نہ تھا۔ ریا کا کام نہ تھا۔ خالص محبت تھی۔ اور سچی خدمت۔ اللہ اللہ! کیا لوگ تھے! کہ جان تک دریغ نہ کرتے تھے۔ خوش قسمت میزبان تھے۔ کہ کامیابی کے ساتھ مہمانوں کی خدمت کرتے تھے۔ اگر کوئی مسافر اُن کی خدمت ہی میں ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو جاتا تھا۔ تو روتے تھے اور پیٹتے تھے۔ یہاں ایک بات دیکھ کر بہت ہی تعجب ہوا۔ بہت کم مسافر ایسے نظر آئے۔ کہ خدمت محافظین کو مدِّ نظر رکھا۔ اِس خدمت کا معاوضہ تو خیر ناممکن تھا۔ جب وہ وقت آتا۔ کہ وہ اِن کے محتاج ہوتے۔ تو یہ آنکھ چُرا جاتے۔ لذائذ نفسانی کے پابند ہو جاتے۔ غیروں سے محبت کرتے۔ دوستوں سے اختلاط کرتے۔ خود محافظ ہوکر مسافروں کی خدمت کرتے۔ لیکن وہ خدمت فراموش کر دیتے۔ جس کی بدولت خدا نے اِس قابل کیا۔ پھر بھی وہ اللہ کے بندے ہر حال میں خوش تھے۔ جس کو سُنا یہ ہی کہتے ہیں "خدمت کرو۔ تمھاری سعادت ہے۔ نہ کرو کچھ شکایت نہیں"

منزلوں مسافروں کے ہمراہ جاتے۔ اور حتی المقدور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ ہر منزل میں خدمت کرتے۔ اور ہر مصیبت میں شریک رہتے اِن میں بعض ناعاقبت اندیش ایسے بھی تھے۔ جو عقل کی آنکھوں پر پردے

ڈال لیتے تھے۔ اور درجۂ محبت کو کمال پہ پہونچا کر جا بیجا کا امتیاز کھو دیتے تھے۔
اچھے برے اعمال اور ناقص افعال کا نمونہ دکھا کر مطالب اصلی خبط کر دیتے تھے
اور پہلے ہی منزل سے مسافر بیچاروں کی باٹ مارنی شروع کر دیتے تھے۔

سرائے طفولیت

سرائے طفولیت ایک عالی شان محل حیات آباد میں آسمان سے کھڑا
باتیں کر رہا تھا۔ شہر کے ہر چہار طرف چونہ گچی کی پختہ عمارتیں بنی ہوئی
تھیں۔ سرائے کے دروازۂ خاص پہ رنگ برنگ کے جھنڈے ہواہیں لہرا رہے
تھے۔ دیواروں کی گلکاریاں۔ محرابوں کی نقش و نگار موسم بہار کا مزہ
دے رہے تھے۔ رنگا رنگ کے جواہرات جڑے ہوے جگمگ جگمگ کر رہے
تھے۔ لوگ خوش حال اور فارغ البال نہ کوئی مفلس نہ کنگال بازار کشادہ
و بارونق۔ دکان دار خلیق و منکسر مزاج عجیب مقام تھا کہ ہر طرف
بے فکری کے ڈنکے بج رہے تھے۔

سرائے کے اندر ہر طرف وسیع و پختہ کمرے بنے ہوے تھے۔ بے فکری کا دور
اطمینان و فارغ البالی کی حکومت تھی۔ امیری کا کارخانہ تھا۔ بادشاہت
کا زمانہ تھا۔ محافظ زیادہ وہی تھے۔ جو منزل اول میں تھے۔ مگر محبت کا
نمبر پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ مسافروں کی قدر و منزلت روز بروز زیادہ ہوتی
جاتی تھی۔ کیا مبارک سر زمین تھی! کہ رنج و غم پاس آکر نہ پھٹکتا تھا۔
نا عاقبت اندیشی۔ انواع و اقسام کی نعمتیں اُن کے دستر خوان پہ چنی دیتی
تھی۔ کھیل کود کے خلعت گراں بہا زیب تن۔ خوشی کا تاج سر پہ لگائے
ہوئے۔ اِدھر اُدھر پھرتے تھے۔ کیا دن تھے۔ کہ پھر نہ آئے!۔ اور کیا جگہ تھی

کہ دوبارہ دیکھنی نصیب ہوئی! بغض و حسد کا گذر نہ تھا۔ فکرِ معیشت کا پتہ نہ تھا۔ دولت و عسرت کا امتیاز نہ تھا۔ نخوت و غلبیت کا نام نہ تھا۔ جو ضرورت ہوئی۔ وہ رفع۔ جو خواہش ہوئی۔ وہ پوری اُن کی بھولی بھولی باتوں اور سیدھے سادے معاملوں پر آسمانِ الطاف سے موتی برس رہے تھے۔ فراغت و اطمینان کا باغ خوشی و خرّمی کے پھول نچھاور کر رہا تھا۔ محبّت و پیار کے ہار گلے میں پڑے تھے۔ کامیابی کے گلدستے طاقوں میں چُنے ہوئے تھے۔ آرام و آسائش کی بیلیں دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ غرض ہر قطع گلزارِ ارم بنا ہوا تھا۔

محافظ و خبر گیر کیسے کیسے خدمت گزار!۔ کہ حکم کی دیر اور تعمیل کو تیّار۔ ایسے ایسے ناز بردار۔ کہ ذرا سے اشارے پر جان نثار کرنے کو آمادہ۔ انتظام اتنا معقول۔ کہ بڑے بڑے سرکش و تاجدار مسافروں کے سامنے عاجز و لاچار تھے۔ اس منزل کا تمام زمانہ آزادانہ و بیباکانہ گذر گیا۔ ضرورت سے پہلے اور حاجت سے پیشتر ہر چیز تیّار اور موجود۔ نہ کسی بات کا کھٹکا تھا نہ کسی قسم کا خوف۔ نہ عزّت کی خواہش تھی۔ نہ دولت کا ارمان۔ نہ نخوت کے اسباب۔ نہ غرور کا سامان۔ جو ملا۔ کھا لیا۔ جہاں نیند آئی۔ وہاں پڑ رہے۔ طبیعت میں شر نہ تھا۔ اور دل میں فساد نہ تھا۔ "کیا ہو گا" کا فکر نہ تھا "کیا ہو گیا" یہ یاد نہ تھا۔ کوئی بات خلاف مزاج ہوئی۔ رو دیے۔ کوئی چیز اچھی ہاتھ آ گئی۔ ہنس دیئے۔ مگر طبیعتوں میں قبولیت کا مادّہ موجود تھا۔ جو سنتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ جو دیکھتے تھے۔ وہ کرتے تھے۔ نتائج سفر کا دارو مدار اسی جگہ تھا۔ ذرا سی لاپروائی بدتر سے بدتر بنا دیتی تھی۔

چمنستانِ شباب

چمنستانِ شباب کی سرحد میں داخل ہوتے ہی طبیعت خود بخود شگفتہ ہونے لگی۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکے دل و دماغ کو ترو تازہ کرنے لگے۔ پھولوں کی تیز اور مست خوشبو سے کوسوں تک جنگل مہک رہا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے۔ دل میں امنگ اور خواہشیں پیدا ہوتی گئیں۔ پاس پہنچ کر دیکھا۔ ایک خوشنما باغ دُور تک چلا گیا ہے۔ دروازے لگے ہوئے ہیں۔ چار دیواری کھینچی ہوئی ہے۔ مگر اندر جانے کے واسطے اجازت عام ہے۔ کسی قسم کی رُوک ٹوک نہیں۔ آگے قدم بڑھایا۔ تمام عالم سرسبز و شاداب نظر آیا۔ ہر قطعہ چمن بہشتِ بریں بنا ہوا ہے۔ رنگ برنگ کے پھول کھل رہے ہیں۔ خوشبوؤں سے ہوا اور ہواؤں نے باغ کو لہکا رکھا ہے۔ گلاب کے تختے پھیلے ہوئے ہیں۔ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے بہ رہے ہیں۔ بار آور درخت گھنیرے جھنڈ جھوم جھوم کر زمین کو چوم رہے ہیں۔ طائرانِ خوش الحان ڈالیوں پر بیٹھے چہکار رہے ہیں۔ ہرے بھرے درخت کھڑے لہلہا رہے ہیں۔ پرند کلیلیں کر رہے ہیں۔ کھلے قطار در قطار چلے گئے ہیں۔ کیلے کی چھاؤں دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ سنگِ مرمر کے حوض بنے ہوئے ہیں۔ رنگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ وسطِ چمن میں ایک بارہ دری ہے۔ چٹا پٹی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مخمل رُومی و کاشانی کا فرش بچھا ہوا ہے۔ کنیزانِ مہ رو سر سے پاؤں تک جواہرات میں ڈوبی زرق برق لباس سے آراستہ پیراستہ اِدھر اُدھر پھر رہی ہیں۔

سرائے طفولیت کی طرف سے مسافر بھاگے دوڑے چلے آ رہے

تھے۔ چمنستانِ شباب کے اسباب دیکھکر اس طرح دل دادہ ہوتے تھے۔
کہ گویا اب تمام عمر یہ فرحت و شگفتگی اُن کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔
اس سرزمین کی ہر چیز میں کچھ ایسا مقناطیسی اثر تھا۔ کہ دل خود بخود
کھنچا چلا جاتا تھا۔ دو چار صورتیں ایسی بھی دکھائی دیں۔ جنھوں نے
اس بات کا پتہ لگا لیا۔ کہ یہ دل فریب جلوے عارضی و فانی ہیں۔
غور سے دیکھا۔ تو درحقیقت تمام چمنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا
گلاب کے پودے کانٹوں سے پٹے پڑے تھے۔ چنبیلی کے پھولوں میں شہد
کی مکھیاں چھپی بیٹھی تھیں۔ بیلوں میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔
چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف شفاف۔ مگر پینے میں زہر ہلاہل۔ چور۔ قزاق
گرہ کٹ۔ اُٹھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ اور اپنے فن کے
ایسے کامل و ہوشیار۔ کہ کیسا ہی تجربہ کار آدمی کیوں نہو۔ بات کی۔ اور
گرفتار ہوا۔ نشے کا سا عالم تھا۔ جو نظر آیا۔ وہ بیخود و سرشار۔ دیواروں
پر خوبصورت تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ مگر تصویر ایک دام تزویر تھا۔ ذرا
آنکھ اُٹھاکر دیکھا۔ اور گلے کا ہار ہوئی۔ جو چیز تھی۔ دیکھنے میں کچھ برتنے
میں کچھ۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں تک میں سمیت ملی ہوئی تھی۔ ذرا ہوا لگی
اور مسافر کچھ کا کچھ ہوا۔ باغ کے اُس طرف ایک بیابان تھا۔ ڈھاکے کا
جنگل کوسوں دور چلا گیا تھا۔ جانور صحرائی ہرطرف بسے ہوئے تھے۔ درندوں
کی خوفناک آواز سے رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھیڑیے بسا اوقات
اندر گھس آتے تھے۔ شیروں کے منھ کو خون لگا ہوا تھا۔ چیتے ہر وقت تاک
لگائے رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بارہا اُدھر نکل جاتا تھا۔
چمنستانِ شباب کے پانی میں خاص طور پر یہ تاثیر تھی۔ کہ مسافر

اپنی اصلیت بھول جاتا تھا۔ حرص و تمنا دامنگیر ہو جاتی تھی۔ خواہش و ارمان کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ مزاج میں نخوت آ جاتی تھی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ جاتے تھے۔ حسن و عشق کی تصویریں دلونکو مسخر کر لیتی تھیں۔ اِتلاف حقوق ظلم و تعدّی عادات ہو جاتے تھے۔ خوف خدا غارت ہو جاتا تھا۔ خود غرضی کا جال ایک طرف بچھا ہوا تھا۔ علائق کی زنجیریں دوسری طرف پڑی ہوئی تھیں۔ غرض از ابتدا تا انتہا چمنستان اور بارہ دری ایک سانچا تھا۔ کہ مسافر کو ڈھالا۔ اور دوسری طرف پھینک دیا۔ گرفتاران بلا ہاتھ میں ہتکڑیاں پاؤں میں بیڑیاں جکڑے ہوئے اور کسے ہوئے دھکّے کھا کھا کر باہر نکلے تھے۔ زمانۂ گذشتہ کی یادگار دو چار کلنک کے ٹیکے وسّی پانچ بدنامیوں کے تمغے باقی رہ جاتے تھے۔ گناہوں کی بھاری گٹھری سر پر ہوتی تھی۔ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ مگر جو قدم اُٹھتا تھا۔ پھر پلٹ نہیں سکتا تھا۔

یہ لوگ اپنے پاؤں میں کلھاڑیاں مارتے تھے۔ ورنہ خود چمنستان شباب کے واقعات اگر چشم بصیرت سے دیکھتے۔ اور تامّل صحیح کرتے۔ تو اصلاح کو کافی تھے۔ بیمار پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ مصیبت زدہ چیخ چلّا رہے تھے۔ قبرستان قبروں سے اور مرگھٹ کھوپڑیوں اور ہڈیوں سے پٹ رہے تھے۔ کوئی ماں کے غم میں سوگوار تھا کوئی باپ کے رنج میں بے قرار کسی کی بہن چھوٹ رہی تھی۔ کسی کا بھائی جدا ہو رہا تھا۔ ایک جوان بیٹی کو رو رہا تھا۔ دوسرا بیٹے پر جان کھو رہا تھا۔ کوئی رو رہا تھا۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ کہیں پیدائش۔ کہیں موت۔ کہیں چھٹی۔ کہیں برات کہیں دن۔ کہیں رات۔ زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز رنج میں ڈوبی

ہوئی - مرد مغموم - عورتیں متفکر - غرض جو تھا بڑھا ہو یا جوان - حیران و پریشان - عظیم الشان محل ویران - پڑے تھے - سنگین و پختہ عمارتیں - سنسان کھڑی تھیں - آبادی بے شمار تھی - مگر ہر ایک اپنے دکھ درد میں گرفتار تھا - بہت سے ایسے بھی تھے - جن کو خدا نے ہر اعتبار سے مالا مال کر رکھا تھا - عنایت ایزدی شامل حال تھی - صاحب اولاد تھے - فارغ البال تھے - مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہوئے تھے - مساہلت و غفلت کی انگلیاں اُن کے کانوں میں ٹھسی ہوئی تھیں اور طمع و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے -

عالم ضعیفی یا دریائے انحطاط

چمنستان اشباب کے اس کنارے پر حیات آباد سے ملا ہوا دریائے انحطاط لہریں لے رہا تھا - لوگ کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر پار اترنے کی کوشش کر رہے تھے - موجوں کے تھپیڑے - پانی کے گرداب - پہاڑوں کی چٹانیں - بادِ مخالف کے جھونکے - دھارے کے سامنے بھی مشکل سے آنے دیتے تھے - غفلت و لاپرواہی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا ہوتا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے - مسافروں کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے - ساتھ کی کشتیاں برابر ڈوبتی چلی جاتی تھیں - اور اپنی بربادی کا خیال بھول کر نہ آتا تھا - حیات ابدی کا تکیہ لگائے ہوئے ہوس داروں کے میٹھے ترانے سنتے چلے جاتے تھے - اختتام سفر کا کوئی وقت معین نہ تھا - زندگی کے تمام سامان کشتیوں میں موجود تھے - اور دنیا بھر کے کاروبار پانی میں ہو رہے تھے - عاقبت اندیشی کا گذر نہ تھا - انجام

پر نظر نہ تھی۔ غرور کا سودا دماغوں میں سمایا ہوا تھا۔ طمع زر وسعت شفقت پھیر رہی تھی۔ ذرائع ناجائز گود میں لوٹ رہے تھے۔ بے ایمانی کی گھٹا سروں پر چھائی ہوئی تھی۔ نام و نمود کے گہرے نشے کوسوں تک تیرہ و تار کر رکھا تھا۔ ناپائداری دنیا کا ابر تلا ہوا سروں پر کھڑا تھا۔ مگر ہٹ دھرمی اور خود پسندی کی خوبصورت دیویاں آنکھ اُٹھانے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ ریاکاری کا تلاطم برپا تھا۔ مکر و فریب کے گھڑیال منہ کھولے بیٹھے تھے۔ اتلاف حقوق کے بھنور جا بجا پڑے تھے۔ مگر یہ اُمید کے بندے "ماچو من دیگرے نیست" کے نعرے مار رہے تھے۔

گناہ اور قصور کے اونچے اونچے پہاڑ پرا جمائے کھڑے تھے۔ قطب نما اور دوربینیں خاک کام نہ کرتی تھیں۔ پاپ کی ناؤ ٹکر کھا کر بیچ منجدھار میں ڈوبتی تھی۔ ساتھ کی کشتیوں کو ڈوبتا دیکھ کر بھی باقی ماندہ ہمسفر احتیاط نہ کرتے تھے۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا۔ کہ جو ڈوبا۔ وہ اسی نتیجے کا سزاوار تھا۔ مجھکو کوئی کھٹکا نہیں۔ دوسری کشتیوں کی تباہی دیکھ کر ہنستے تھے اور جب اپنے اوپر آکر پڑتی تھی۔ تو چیختے جاتے تھے اور ڈوبتے جاتے تھے۔

دریائے انحطاط میں ایک جزیرہ نظر آیا "جزیرۂ ندامت" چند نیک سیرت بزرگ صورت پھوس کی جھونپڑیاں ڈالے ہوئے سرنگوں بیٹھے تھے۔ اُن کی سپید داڑھیاں۔ اُن کے چہروں پر نور برسا رہی تھیں۔ فضیلت کے بڑے بڑے عمامے سر سے بندھے ہوئے تھے۔ مگر فتنہ پردازی کی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور گھٹے پڑی ہوئی پیشانیوں پر کلنک کا ٹیکا چمک رہا تھا۔ افعالِ گذشتہ کا تاسف اور اعمال کی پشیمانی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ سر سے پیر تک عرق خجالت میں ڈوبے

ہوئے تھے۔ آسمان پر نگاہ تھی۔ اور لب پر اللہ ہی اللہ تھا۔

ایک گروہ دیکھا۔ قوےٰ بالکل بیکار ہو گئے تھے۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ سر پر موت منڈلا رہی تھی۔ مگر حسرت و ارمان دونوں طرف مورچھل ہلا رہے تھے۔ انقلاب زمانہ نے اُن کی صورتیں بگاڑ دی تھیں۔ دنیا اُنسے بھاگ رہی تھی۔ اور وہ دُنیا کو پٹ رہے تھے۔

ایک جم غفیر عورتوں کا ایسا ملا۔ کہ اِس کبرسنی میں بھی جب کہ قبر دل میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ اپنی نمائش ظاہری سے فرصت نہ تھی۔ بغض و حسد کا کاجل آنکھوں میں پھیلا ہوا تھا۔ نخوت و غیبت کے تیل سے سر گندھے ہوئے۔ کذب و افترا کا زیور پہنے ہوئے۔ نافرمانی کا جھومر لگا ہوا۔ مکر و فریب کا تکیہ لگائے ہوئے۔ حیات ابدی کا پٹہ لکھائے ہوئے تن تن کر اپنے حُسنِ صورت کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک شخص کو دیکھا آنکھوں سے اندھا۔ ہاتھوں سے لولا۔ پاؤں سے لنگڑا۔ منہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں۔ ڈاڑھی سفید بگلے کا پر۔ پلکیں رُوئی کا گالا۔ ایک درخت کے نیچے کھڑا بیاج کے ٹوٹے کو رو رہا تھا۔

اِس سے ملی ہوئی سرحد عدم آباد تھی جس کی پختہ سنگین فصیل آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ بلندی کا یہ حال تھا۔ کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ وسعت و رفعت کی یہ کیفیت تھی۔ کہ اندر کی آواز باہر نہ آتی تھی مسافروں کو لوگ پھاٹک تک پہونچا سکتے تھے۔ آگے کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔ "مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنا سفر نیک نامی کے ساتھ پورا کر کے آئے"۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ

پیدائش دلّی ۱۱۲۵ھ وفات لکھنؤ ۱۱۹۵ھ

سوداؔ تخلص۔ مرزا محمد رفیع۔ نام۔ شہر دہلی کو آنکے کمال سے فخر تھا ان کے باپ مرزا محمد شفیع میر زایانِ کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مرزا محمد شفیع بطریقِ تجارت وارد ہندوستان ہوے۔ ہند کی خاک دامن گیر نے ایسے قدم پکڑے کہ یہیں رہے

سوداؔ ۱۱۲۵ھ میں دلّی میں پیدا ہوے۔ اور وہیں پرورش اور تربیت پائی کابلی دروازہ کے علاقہ میں ان کا گھر تھا۔ بموجب رسم زمانہ پہلے سلیمان قلی خان ودادؔ کے پھر شاہ حاتمؔ کے شاگرد ہوے۔ خان آرزوؔ کے شاگرد نہ تھے۔ مگر اُن کی صحبت سے فائدے بہت حاصل کئے چنانچہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ خان آرزو کی فہمایش سے اُردو زبان میں شعر کہنے لگے طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلّی جیسے شہر میں انکی اُستادی نے خاص وعام سے اقرار لیا۔ کہ ان کے سامنے ہی ان کی غزلیں گھر گھر اور کوچہ و بازار میں خاص و عام کی زبانوں پر جاری تھیں۔

جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا۔ تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے۔ مرزا بڑے نازک مزاج اور نہایت غیور تھے۔ ایک دن کسی بات پہ بادشاہ سے ناراض ہوگئے۔ ہر چند بادشاہ نے بلوایا۔ نہ گئے۔ دہلی کے اکثر اُمرا خصوصاً مہربان خان و بسنت خاں ان کی بڑی قدر کرتے تھے فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔

جب ان کے کلام کا شہرہ لکھنؤ تک پہونچا۔ تو نواب شجاع الدولہ نے کمال اشتیاق سے خط لکھکر خرچ سفر بھیجا۔ اور طلب کیا۔ انھیں

دلّی چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ جواب میں فقط اِس رباعی پر حسنِ معذرت کو ختم کیا۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک ؟ آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک ؟
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہوئے بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک ؟

کئی برس کے بعد وہ قدر دان مرگئے۔ زمانے بدل گئے۔ سودا بہت گھبرائے۔ ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر میں انکو دلّی چھوڑنا پڑا۔ چند روز فرّخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے وہاں سے لکھنؤ پہونچے۔ **نواب شجاع الدولہ** کی ملازمت حاصل کی۔ وہ بہت اعزاز سے ملے۔ اور ان کے آنے پر کمال خوشنودی ظاہر کی۔ لیکن یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے اتنا کہا کہ "مرزا وہ رباعی تمھاری اب تک میرے دل پر نقش ہے" اور اسی کو مکرّر پڑھا۔ انھیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا۔ اور بپاسِ وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہاں تک کہ شجاع الدولہ مرگئے۔ نواب شجاع الدولہ کے بعد اُن کے بیٹے **نواب آصف الدولہ** نے چھ ہزار روپیہ وظیفہ مقرّر کردیا۔ اور نہایت عزت سے ان کو رکھا۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وہیں انتقال کیا۔

سودا اُردو کے مسلّم الثبوت اُستاد ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر اردو میں قصائد کا کہنا۔ اور پھر اس دھوم دھام سے۔ اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہونچانا ان کا پہلا مفخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عنان درعنان ہی نہیں گئے۔ بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے کلام کا زور وشور انوری اور خاقانی کو دبا تا ہے۔ اور نزاکتِ مضمون میں عرفی وظہوری کو شرماتا ہے۔

مرزا کے کلام کے خصوصیات۔ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور، مضمون کی نزاکت سے ایسا دست وگریبان ہے۔ جیسے آگ

کے شعلے میں گرمی اور روشنی. بندش کی چستی و ترتیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں۔ گویا ولایتی طپنچہ کی چاپتیں جڑی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے بھی اُن کے کلام میں ہیں۔ مگر اتنے۔ جیسا کھانے میں نمک۔ ان کی طبیعت ایک ڈھنگ کی پابند نہ تھی۔ نئے نئے خیال اور قافئے جس پہلو سے چسپ دیکھتے۔ جما دیتے تھے۔

جن اشخاص نے زبانِ اُردو کو پاک صاف کیا ہے۔ مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے۔ جو کہیں سے جدا نہیں معلوم ہوتے۔ ہندی زبان کو فارسی محاوروں اور استعاروں سے نہایت زور بخشا ہے انھیں کا زورِ طبع تھا۔ کہ جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترکیب پاکر تیسری زبان پیدا ہو گئی۔ اور ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی۔ کہ آئندہ کے لیے وہ ہی ہندوستان کی زبان ٹھہری جس نے حکّام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کر لیا۔

مرزا قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ مگر غزل میں میر کے برابر سوز و گداز نہیں تصوف ان کا حصّہ نہیں۔ وہ میر درد کے حصّہ کا مضمون ہے۔

۱۔ قصیدہ بہاریہ

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — تیغ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک — دیکھ کر باغِ جہان میں کرمِ عزّ و جل

قوّتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ — آب جو قطع لگے کرنے روش پہ مخمل

بخشتی ہے گلِ نورستہ کی رنگ آمیزی — پوششِ چھینٹِ قلمکار بہ دشت و جبل

عکسِ گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جسکے آگے — کارِ نقاشیِ مانی ہے دوم وہ اوّل
تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ — ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بار سے آب رواں عکسِ ہجوم گل کے — لوٹے ہے سبزہ پہ از بس کہ ہوا ہے بے کل
شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم ہے پہونچی — شمع ساں گرمیِ نظارہ سے جاتی ہے پگھل
جوشِ روئیدگیِ خاک سے کچھ دور نہیں — شاخ میں گاؤ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل
دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک — دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل
فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی — کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل
حدِ ایام کے پیش از مددِ نامیہ سے — بچۂ مرغِ چمن تخم سے آتا ہے نکل
سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب سے ہر بار — جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل
دستِ گل خوردہ و شاخ گل و گلزار بہم — بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل
غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب دخل ہے یہ — گل بہم پہونچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کا حل
آوے ہے انکے نظر لا کہ طرح کا وہ پھول — ان گلوں چھٹ جو نگہ کے ہیں سدا مستعمل
یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا — چاہتی ہے بسماجت کرے سبزے سے بدل
چشمِ نرگس کی بصارت کے زبس ہے درپے — غنچۂ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے مکحل
اس قدر محوِ تماشا ہے کہ نرگس کی طرح — چشم سیار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل
آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے — خطِ گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر — ساغرِ لعل میں جوں کیجئے زمرد کو حل
رنگ نے ریتۂ آئینہ کیا ہے پیدا — تیغ کہسار ہوئی بس کہ ہوا ہے صیقل
برگ برگِ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے — گل کو دیکھو تو لگا جا رہے سنبل پہ پھسل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم — پانوں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اتنی ہے کثرتِ لغزش بہ زمینِ ہر باغ — جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل

فیضِ تاثیرِ ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے ۔۔۔ شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل
دانہ جس شور زمین میں نہ پھلا دہقاں سے ۔۔۔ سبز واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل
کشت کرنے میں ہر اک تخم سے از فیض ہوا ۔۔۔ گرتے گرتے بنے ہیں برگ و بر آتا ہے نکل
جوہری کو چمنستانِ جہاں میں اس فصل ۔۔۔ آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل
تا کجا شرح کروں میں کہ بقولِ عرفیؔ ۔۔۔ اخگر از فیضِ ہوا سبز شود در منقل

قصیدہ - ۲

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی ۔۔۔ نہ ٹوٹی شیخ سے زنّار تسبیحِ سلیمانی
ہنر پیدا کر اوّل ترک کیجو تب لباس اپنا ۔۔۔ نہ ہو جوں تیغ بے جوہر دگر ننگ عریانی
فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہِ دل ہووے ۔۔۔ نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پشیمانی
خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی؟ ۔۔۔ نہ جھاڑے آستیں کہکشاں شاہوں کی پیشانی
عروجِ دستِ ہمت کو نہیں کچھ قدرِ بیش و کم ۔۔۔ سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زر افشانی
کرے ہے کلفتِ ایام ضائع قدر مردوں کی ۔۔۔ ہوئی جب تیغ زنگ آلود کم جاتی ہے پہچانی
اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا ۔۔۔ ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے عمرِ خضر طولانی
اذیت وصل میں دونی جدائی سے ہو عاشق کو ۔۔۔ بہت رہتا ہے نالاں فصلِ گل میں مرغِ بستانی
موقر جہاں اربابِ ہنر کو بے لباسی میں ۔۔۔ کہ ہو جو تیغ یا جوہر اسے عزت ہے عریانی
برنگِ کوہ رہ خاموش حرفِ ناسزا سن کر ۔۔۔ کہ تا یہ گو صدائے غیب سے پہنچے پشیمانی
یہ روشن ہے برنگِ شمع ربطِ باد و آتش سے ۔۔۔ موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمنِ جانی
نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا ۔۔۔ قفس جب تک ہے داغِ دل سے فرصت کیونکر ہو پانی
کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو ۔۔۔ کہ زیبِ ترکِ چشمِ یار سرمہ ہے صفاہانی
طلوعِ مہر ہو پامال حسرت آسماں آ دیپہ ۔۔۔ لکھوں گا پھر غزل گر اس زمیں میں مطلعِ ثانی

مطلع ثانی

عجب ناداں ہیں جنکو ہے عجب تاج سلطانی ! / فلک باں ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

نہیں معلوم ان نے خاک میں کیا کیا بلا دیکھا / کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی

ہماری آہ دل تیرا نہ نرماوے تو یا قسمت / وگرنہ دیکھ آئینہ کو پتھر ہوگئے پانی

تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا / کہ ہے جمعیت خاطر مجھے ان کی پریشانی

زمانے میں نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیراں ہوں / گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکہ بآسانی

جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کاہیدہ اتنا ہوں / کہ اعضا دیدۂ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی

نہ رکھا جگ میں رسم دوستی اندوہ روزی نے / مگر زانو سے اب باقی رہا ہے ربط پیشانی

سیہ بختی میں اے سودا نہیں طول امل لازم / نمط خامے کے سر کٹوائے گی ایسی زباندانی

سمجھ اسے ناقباحت فہم اب تک یہ بیاں ہوگا / ادائے چین پیشانی و لطف زلف طولانی

خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے / نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل انکے چشم و زلف کے اوپر / مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی

غزلیات

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا / جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھادے / کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ / جوں شمع حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن / جب چشم کھلی گل کی تو عالم ہے خزاں کا

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار / لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا

سودا جو کبھی گوش سے ہمت کے سنے تو / مضموں یہی ہے جرس دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

۲

کرتا ہوں سیر جب سے باغ جہاں بنایا کیا جانے گل خدا نے تجھ سا کہاں بنایا
اک نام تو سنا ہے۔ دیکھا نہیں کسو نے حق نے نشانِ عنقا تیرا دہاں بنایا
جتنے ہیں خوبرویاں سب دل ستاں ہیں لیکن اللہ نے تجھی کو اک جاں ستاں بنایا
جنسِ دوم کو اوّل بزاز کھولتا ہے یوسف سے تو بہا میں تجھکو گراں بنایا
صدقے میں تیرے یارب ہم سوں کو کرکے پیدا گلے کا آپ کو تیں اِک پاسباں بنایا
دیر و حرم کو دیکھا۔ اللہ رے فضولی! یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا
تو مت پکار اس کو اے باغباں! کہ ہم نے نزدیکِ آتشِ گل آب آشیاں بنایا
عالم کے قمری آسا ہے طوق بندگی کا قامت کو تیرے جب سے سرو رواں بنایا
اکثر نشاں بنے ہیں عالم میں نام خاطر تو نے سخن کو سودا اپنا نشاں بنایا

۳

اعمال سے میں اپنے بہت بے خبر چلا آیا تھا آہ کس لئے اور کیا میں کر چلا
بے فکرِ وصل صبح۔ تو اندوہِ ہجر شام اس روز و شب کے دھندے میں میرا بہا تو مرچلا
مجلس سے مجھکو اٹھتے جلیسوں کے سامنے عزت کبھو نہ دی یہ کہ پوچھے "وہ کدھر چلا؟"
کیا اس چمن میں اس کے لیجائے گا کوئی؟ دامن کو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا

۴

سیرِ چمنِ عمر جو کی ہم نے تو کیا ہیچ؟ رنگین ہے جوانی کا گل اس میں سو لیکا ہیچ
شیشے کو بھی توڑو تو نکلتی ہے اِک آواز عاشق ہی کا وہ دل ہے کہ ٹوٹے تو صدا ہیچ
اسبابِ جہاں دل نے کیا جب نظر انداز پوچھا جو میں کیا دیکھے ہے دیوانے کہا "وہ ہیچ"
اس جامہ پہ اِتنا نہ اپھر بلبلے کی طرح جامہ یہ ترا پوچ ہے تو غیر ہوا ہیچ

کیا قافلۂ عمر سبک رو ہے کہ جس میں — چاہیے جو تجھے سامعہ آوازِ درا ہیچ
شاہان سے سوال اپنا رعونت شکنی ہے — کو نیں تلک ورنہ ہے پیشِ فقرا ہیچ

۵

دل نا آشنائے نالہ سے صد رہ جرس بہتر — نہ ہو مژگاں جو خونِ آغشتہ اُن سے خار و خس بہتر
نہ دیکھی خوش دلی جز یک تبسّم ہم نے غنچے میں — ہوا سے اس چمن کی ہے ولا ترکِ ہوس بہتر
وفا نے گل میں لے چشمِ مروّت باغباں میں ہے — نکل بلبل! کہ ہے اس باغ سے کنجِ قفس بہتر
نظر میں انکی جنکو دولتِ استغنائی بخشی ہے — مگس سے ہے ہما بہتر ہما سے ہے مگس بہتر
بلند آتش جہاں ہووے ہوائے جنبشِ لب سے — تو اپنی فہمِ ناقص میں ہے واں ضبطِ نفس بہتر
بگردِ دل ہے طوفِ کعبہ سے نزد اپنے اے منعم! — بسانِ دانہ ہائے سبحہ پھر نا پیش و پس بہتر
کہے ہے دیکھکر شانے کو یہ سودائے دیوانہ — شبِ تاریک میں تنہا نہیں گشت اے عسس بہتر

۶

جاتے ہیں لوگ قافلۂ کے پیش و پس چلے — دنیا عجب سرا ہے جہاں آکے بس چلے
کہیو صبا! سلام ہمارا بہار سے — ہم تو چمن کو چھوڑ کے سوئے قفس چلے
اے غنچہ آنکھ کھول کے ٹک تو چمن کو دیکھ — جمعیت دلی پہ تری پھول ہنس چلے
تیرے سخن کو میں بہ سرو چشم ناصحا! — مانوں ہزار بار اگر دل سے بس چلے
نکلا جو دل سے نالہ۔ تو سینے سے دوڑے اشک — سن مردمانِ قافلۂ بانگِ جرس چلے
صیاد اب تو کیجیے قفس سے ہمیں رہا — ظالم پھڑک پھڑک کے یہ دو بال گھس چلے
کام اس گلی میں سر سے یہ سودا گذر چکا — کیا تاب ایک قدم جو اُدھر بوالہوس چلے

خواجہ میر درد

پیدائش دہلی ۱۱۳۱ھ — وفات دہلی ۱۱۹۹ھ

درد تخلص خواجہ میر نام زبان اُردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن

ہیں۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب ان کے باپ تھے اور شاہ گلشن صاحب سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ خاندان ان کا دلی میں بباعث پیری و مریدی کے نہایت معزز اور معظم تھا۔ علوم رسمی سے آگاہ تھے۔

ان کا دیوان اُردو مختصر ہے۔ سوا غزلیات اور ترجیع بند اور رباعیوں کے اور کچھ نہیں قصائد و مثنوی وغیرہ۔ کہ عادت شعرا کی ہے۔ انھوں نے نہیں لکھی باوجود اس کے سودا اور میر تقی کی غزلوں پہ جو غزلیں لکھی ہیں۔ ہرگز اُن سے کم نہیں۔

تصنیف کا شوق طبیعت میں خدا داد تھا۔ علم تصوّف میں بہت سے رسالے اور بڑی بڑی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ان کی غزل ۷ شعر ۹ شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آب داری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے سوؔدا کی طرح ان کی زبان آلودہ نہیں ہوئی تصوّف جیسا انھوں نے کہا۔ اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا

خواجہ صاحب ۲۴ صفر یوم جمعہ ۱۱۹۹ھ ۶۸ برس کی عمر میں شہر دہلی میں فوت ہوئے کسی مرید یا اعتقاد نے تاریخ کہی ع "وحیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب"۔

غزلیات

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا؟ | حقّا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
اس مسندِ عزّت پہ کہ تو جلوہ نما ہے | کیا تاب گذر ہووے تعقّل کے قدم کا؟
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن | آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگرچہ جی میں۔ تو ہے تیرے غضب سے | اور دل میں بھروسا ہے۔ تو ہے تیرے کرم کا
مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی | کھینچا نہ پہ اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

۲

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا　　ہم سبھی مہمان تھے واں توہی صاحبخانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں　　آشنا اپنا بھی واں اِک سبزۂ بیگانہ تھا

ہوگیا مہمان سرائے کثرتِ موہوم آہ　　وہ دلِ خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وہ سابقے مت یاد کر　　درد یہ مذکور کیا ہے؟ آشنا تھا یا نہ تھا

۳

اکسیر پہ مخوس اتنا نہ ناز کرنا　　بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا

کب دل ملے کسی کا ہم غمزدوں سے کھلکر؟　　ہے اپنے دل سے لازم چون غنچہ ساز کرنا

اے آنسوؤ! نہ آوے کچھ دل کی بات منہ پر　　لڑکے ہو تم۔ کہیں مت افشائے راز کرنا

تو اپنے ہاتھوں آپ ہی پڑتا ہے تفرقہ میں　　اے امتیاز نادان ٹک امتیاز کرنا

ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ؟　　جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

۴

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا　　ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

یارب! یہ دل ہے یا کوئی مہمان سرائے ہے؟　　غم رہ گیا کبھو کبھو آرام رہ گیا

ساقی! مرے بھی دل کیطرف ٹک نگاہ کر!　　لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا

تلو یار سوزِ دل نے ہے دی آگ پر ہنوز　　دل وہ کباب ہے کہ جگر خام رہ گیا

ہم کب کے چل بسے تھے پہ اے ذوقِ وصال!　　کچھ آج ہوتے ہوتے سرانجام رہ گیا

ازبسکہ ہم نے حرف دوئی کا اٹھا دیا　　اے درد اپنے وقت میں ایہام رہ گیا

۵

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہوگئے بدن خالی — جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سَو سَو طرح سے مر دیکھا
زور عاشق مزاج ہے کوئی — دردؔ کو قصہ مختصر دیکھا

۶

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا — تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے — مری یاد تجھکو دلاتا رہے گا
گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں — میں پہونچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا
جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے — تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا
قفس میں کوئی تم سے اے ہم صفیرو — خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا
خفا ہو کے اے دردؔ مر تو چلا تو — کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

۷

دنیا میں کون کون نہ یکبار ہو گیا؟ — پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے جو گیا
پھرتی ہے میری خاک صبا در بدر لئے — اے چشمِ اشکبار! یہ کیا تجھکو ہو گیا
آگاہ اس جہاں سے نہیں غیر بیخودان — جاگا وہ ہی ادھر سے جو موند آنکھ سو گیا
طوفانِ نوح نے تو ڈبائی زمیں فقط — میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا
واعظ کسے ڈرائے ہے یوم الحساب سے؟ — گریہ مرا تو نامۂ اعمال دھو گیا
پھولے گی اس زبان سے گلزارِ معرفت — یاں مَیں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا
آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ دہر — میں گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو گیا
اے دردؔ جسکی آنکھ کھلی اس جہاں میں — شبنم کی طرح جان کو اپنی وہ رو گیا

۸

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ — کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں — کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
اذیت مصیبت ملامت بلائیں — ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا!
کیا مجھکو داغوں نے سرو چراغاں — کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا؟
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے — ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا
حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا
شب و روز اے درد درپے ہوں اسکے — کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

۹

جوں نورِ نظر ترا تصور — تھا پیش نظر جدھر گئے ہم
جز اہل صفا بتا تو جوں عکس — اے آئینہ کس کے گھر گئے ہم
کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے؟ — معلوم نہیں کدھر گئے ہم
تھا عالم جبر کیا بتائیں — کس طور سے زیست کر گئے ہم
جس طرح ہوا اسی طرح سے — پیمانۂ عمر بھر گئے ہم
افسوس کہ درد اسکو جب تک — آوے ہے خبر گذر گئے ہم

۱۰

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم — تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم
جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی — ساتھ اپنے دوچار ہو گئے ہم
ماتم کدۂ جہاں میں جوں ابر — اپنے تئیں آپ رو گئے ہم
ہستی نے تو ٹک جگا دیا تھا — پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم

یاروں ہی سے درد ہے یہ چرچا — پھر کوئی نہیں ہے جو گئے ہم

۱۱

گلیم بختِ سیہ سایہ دار رکھتے ہیں — یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں
بسانِ کاغذِ آتش زدہ مرے گلرو! — ترے جلے بجھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں
بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ! — سب اہلِ قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں
جہاں کے باغ سے ہم دل سوا نہ پھل پایا — فقط یہی ثمر داغدار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر؟ — مگر یہ زندگیِ مستعار رکھتے ہیں
فلک سمجھ تو سہی ہمسے اور گلوگیری — یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں
نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلہ نے سیماب — وہ کچھ ہیں پر کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں
جنھوں کے دل میں جگہ کی ہے نقشِ عبرت نے — سدا نظر میں وہ لوحِ مزار رکھتے ہیں
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا — اگرچہ درد اسے ہم ہزار رکھتے ہیں

۱۲

کیا فرق داغ و گل میں کہ جس گل میں بو نہ ہو؟ — کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو؟
جو کچھ کہ ہم نے کی ہے تمنا ملی مگر — یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو
جوں شمع جمع ہوویں گر اہلِ زباں ہزار — آپس میں چاہیے کہ کبھی گفتگو نہ ہو
جوں صبح چاک سینہ مرا اے رفوگراں! — یاں تو کسو سے ہاتھ بھی ہرگز رفو نہ ہو!
اے درد زنگِ کدورت اگر اس میں جا کرے — اہلِ صفا میں آئینۂ دل کو رو نہ ہو

۱۳

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے — لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے
فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی — خطرہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے
حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ — یاں تک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

اس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں — اے نشئہ ظہور یہ تیری ترنگ ہے
گلگیر منہ پسار نہ تو شمع کی طرف — اس کی زبان ہی اُسے کام نہنگ ہے
عالم سے اختیار کی ہر چند صلح کل — پہ اپنے ساتھ مجکو شب و روز جنگ ہے
میں کیا کہوں تجھے نظر آیا نہیں ہے کیا؟ — اس گلشنِ جہان کا جو کچھ کہ ڈھنگ ہے
غنچہ شگفتہ ہووے ہے ہووے کہ آہیں درد — دیکھا چمن مین جاکے تو کچھ اور رنگ ہے

۱۴

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے؟ — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے — آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے!
میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے — نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے
قاصد! نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے — اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے!
غافل! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار — اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے
یارب یہ کیا طلسم ہے ادراکِ فہم یاں — دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے
گو بحث کرکے بات بٹھائی۔ پہ کیا حصول — دل سے اُٹھا خلاف اگر تو اٹھا سکے
مستِ شرابِ عشق وہ بیخود ہے جسکو حشر — اے دردؔ چاہیے لائے بیخود پھر نہ لا سکے

۱۵

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے — جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟ — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا! — ایک دم آئے اِدھر اُودھر چلے
دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس — تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں — چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
ڈھونڈھتے ہیں آپ سے اسکو پرے — شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے ۔۔۔ ساتھ اپنے اب اسے لیکر چلے
جوں شرار ہستی بے بود ! یاں ۔۔۔ بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ساقیا ! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ ۔۔۔ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
دردؔ ۔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب ۔۔۔ کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

رباعیات

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان میں دیکھا ۔۔۔ جو کچھ کہ سنا تجھ میں سو انسان میں دیکھا
جوں غنچہ بجز اک دلِ صد چاک نہ پایا ۔۔۔ منہ ڈال کے جب میں نے گریبان میں دیکھا

۲

دلِ ناداں کو یاد کرکے صبا ! ۔۔۔ اتنا کہنا جہاں وہ قاتل ہو
نیم بسمل کوئی کسو کو چھوڑ ۔۔۔ اس طرح بیٹھتا ہے غافل ہو؟

۳

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ ۔۔۔ بندہ گر آوے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ
آہن ہو یا ہو سنگ ہے سب جلوہ گاہِ یار ۔۔۔ جوں آئینہ ہر ایک گذر میں صفا کو دیکھ

۴

یہی پیغام دردؔ کا کہنا ۔۔۔ گر کوئی کوے یار میں گذرے
کون سے رات آن ملئے گا؟ ۔۔۔ دن بہت انتظار میں گذرے

۵

ہمارے جامۂ تن میں نہیں کچھ اور بس باقی ۔۔۔ گریباں میں ہے مثلِ صبح اک تارِ نفس باقی
یکایک عشق کی آتش کا شعلہ اس قدر بھڑکا ۔۔۔ نہ چھوڑا اس سرزمینِ دل میں کوئی خار و خس باقی

۶

گر معرفت کا چشم بصیرت میں نور ہے — تو جس طرف کو دیکھئے اُس کا ظہور ہے
آتی ہے دل میں اور ہی صورت نظر مجھے — شاید یہ آئینہ بھی کسی کے حضور ہے

۷

پیدا کرے ہر چند تقدس بندہ — مشکل ہے کہ ہو حرص سے دل برکندا
جنت میں بھی اکل و شرب سے کب ہے نجات — دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندا

۸

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی — اے دردؔ کہاں ہے زندگانی اپنی!
کل اور کوئی بیان کرے گا اسکو — کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

۹

ہر بت کے لئے کب تئیں مرتے رہیے؟ — کب تک یہ کفر دل میں بھرتے رہیے؟
اب دردؔ جو کچھ کہ زندگی باقی ہے — اللہ کو اپنے یاد کرتے رہیے

میر محمد تقی میر

۲۰۹

پیدائش اکبرآباد ۱۱۲۵ھ — وفات لکھنؤ ۱۲۲۵ھ

میرؔ تخلص۔ محمد تقی۔ نام۔ خلف میر عبداللہ۔ شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد دلی میں آئے۔ اور سراج الدین علی خاں آرزو (جو ان کے رشتہ دار تھے) کے پاس انھوں نے پرورش پائی۔ فن شاعری میں وہ کمال پیدا کیا۔ کہ ہر چند اُن کا تخلص میرؔ تھا۔ مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب ہوکر چمکے۔ قدردانی نے اُن کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں۔ دیکھا۔ اور نام کو پھولوں کی مہک بناکر اڑایا۔ ہندوستان میں یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر میں لیجاتے تھے۔

دلّی کی سلطنت کے زوال کی وجہ سے تنگدستی سے پریشان ہوکر ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ آئے۔ ایک سرائے میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جاکر شامل ہوئے۔ ان کی قدیمانہ وضع کو دیکھکر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بیچارے غریب الوطن زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی شکستہ دل تھے۔ اور بھی دل تنگ ہوئے۔ اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی۔ تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ "حضور کا وطن کہاں ہے"؟ میر صاحب نے فوراً ہی یہ قطعہ لکھکر غزلِ طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو۔ پورب کے ساکنو ہمکو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی۔ کمال کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں شہرہ ہوگیا۔ کہ میر صاحب تشریف لائے۔ رفتہ رفتہ نواب **آصف الدولہ** مرحوم نے سُنا۔ اور دوسَو روپیہ مہینہ کردیا۔ لیکن بد دماغی اور نازک مزاجی نے جو آن کے ذاتی مصاحب تھے۔ یہاں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک دن نواب صاحب سے کسی بات پر بگڑ گئی۔ دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا۔ اور بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں گذارہ کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ سَو برس کی عمر پائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی ع

"واویلا مُرد شہِ شاعران۔"

کلام کے خصوصیات۔ میر صاحب کی زبان شُستہ۔ کلام صاف بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں۔ محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کردیتے ہیں۔

اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے۔ کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں یہی سبب ہے۔ کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں۔ وہ گویا اردو کے سعدیؔ ہیں۔

ایشیا کے تمام شعرا حسرت۔ مایوسی۔ ناکامی کا دکھڑا روتے ہیں۔ مگر ان کے تمام مضامین خیالی ہیں۔ اور میر صاحب کے حالی اس لئے کہ میر صاحب کی ساری عمر مصیبت اور غم میں گذری اور ان کی طبیعت قدرتی دردخیز اور دل حسرت انگیز تھا۔ کہ غزل کی جان ہے۔ ان کا کلام صاف کہے دیتا ہے۔ کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں۔ وہ غم و درد کا پتلا نہیں حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا۔ ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے۔ بس جو دل پر گذرتے تھے وہی زبان سے کہدیتے تھے۔ کہ سننے والوں کے لئے نشتر کا کام کر جاتے تھے۔

ان کی غزلیں ہر بحر میں ہیں۔ کہیں شربت اور کہیں شیر و شکر ہیں۔ مگر چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آبحیات بہاتے ہیں۔ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے۔ تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔ ان کی غزل اصول غزلیت کے لحاظ سے سوداؔ سے بہتر ہے۔

ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے۔ اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے۔ اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز رہے۔

چونکہ مطالب کی دقت۔ مضامین کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شان و شکوہ بندش کی چستی لازمہ قصائد کا ہے وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میر صاحب کے قصیدے کم ہیں۔ اور اسی قدر درجہ میں بھی کم ہیں انھوں نے طالب سخن پر روشن کر دیا ہے۔ کہ قصیدہ اور غزل کے دو میدانوں

ہیں دن اور رات کا فرق ہے۔ اور اسی منزل میں آکر سوداؔ اور میرؔ کے کلام کا حال کھلتا ہے۔ نقادانِ سخن کی یہ رائے ہے کہ جو مرتبہ مرزا کا قصیدے میں ہے وہی مرتبہ میرؔ کا غزل میں ہے۔

غزلیات

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا
پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم! — یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہ طور تھا
مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر — کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا
کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر! — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

۲

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا — کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت ؟ — اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زندان میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
یہ زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا — انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا
وہ موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گذرے — مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا
اس رنگ سے جھلکے ہے پلک پر کہ کہے تو — ٹکڑا ہے ترا اشک عقیقِ جگری کا
کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر — تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

۳

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا
اپنے کیے کا اُن نے ثمرہ شتاب دیکھا

آباد جس میں تم کو دیکھا تھا ایک مدت
اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

لیتے ہی نام اُسکا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

۴

جب جنوں سے ہمیں توسل تھا
اپنی زنجیرِ پا ہی کا غل تھا

بسترا تھا چمن میں جوں بلبل
نالہ سرمایۂ توکل تھا

اک نگہ کو وفا نہ کی گویا
موسمِ گل صفیرِ بلبل تھا

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار
یادِ ایام جب تحمل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقت خوش میر نکہتِ گل تھا

۵

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا

ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
خیال ہی کبھو گذرا نہ پرفشانی کا

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلا تھا پانی کا

۶

گل و بلبل بہار میں دیکھا
ایک تجھکو ہزار میں دیکھا

جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں
یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا

آبلے کا بھی ہونا دامن گیر — تیرے کوچے کے خار میں دیکھا
تیرہ عالم ہوا یہ روز سیاہ — اپنے دل کے غبار میں دیکھا
جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے — اُن کو اِس روزگار میں دیکھا

۷

غلط تھا آپ سے غافل گذرنا — نہ سمجھے ہم کہ اِس قالب میں تو تھا
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ — کہ ہر غنچہ دلِ پُر آرزو تھا
گُل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا — جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رُو تھا
کروگے یاد باتیں تو کہوگے — کہ کوئی رفتۂ بسیار گو تھا
جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے — دماغِ عشق ہمکو بھی کبھو تھا
مگر دیوانہ تھا دل بھی کسو کا — کہ پیراہن بھی سَو جاگہ رفو تھا
نہ دیکھا میرِؔ آوارہ کو لیکن — غبارِ اِک ناتواں سا کو بکو تھا

۸

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟ — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟
قافلے میں صبح کے اِک شور ہے — یعنی غافل! ہم چلے سوتا ہے کیا؟
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا؟
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز — میرؔ اِس کو رائگاں کھوتا ہے کیا؟

۹

بارہا گور دل جھکا لایا — اب کی شرطِ وفا بجا لایا
قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل — سارے عالم میں میں دکھا لایا
دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لیجا کر — اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار — عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

۱۰

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دل کے جانے کا نہایت غم رہا
حسن تھا تیرا بہت عالم فریب — خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا
دل نہ پہونچا گوشۂ داماں تلک — قطرۂ خوں تھا جگر پر جم رہا
سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمے کو سیاہ — اس میں مجنوں کا مگر ماتم رہا
جامۂ احرام زاہد پر نہ جا — تھا حرم میں لیک نامحرم رہا
میرے مرنے کی حقیقت جس میں تھی — ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
صبح پیری شام ہونے آئی میر — تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

۱۱

غلط ہے عشق میں اے بوالہوس اندیشہ راحت کا — رواج اس ملک میں ہے درد و داغ و رنج و کلفت کا
وہیں ایک صفحۂ تصویر بیہوشاں سے مانا ہے — یہ مجلس جب سے ہے اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا
جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے — نظر پیدا کر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا
ہنوز آوارۂ لیلیٰ ہے جانِ رفتہ مجنوں کی — موئے پہ بھی رہا ہوتا نہیں وابستہ الفت کا
خرابی دل کی۔ اِس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا — کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
قدم ٹک دیکھکر رکھ میر ہر دل سے نکالے گا — پلک سے شوخ تر کانٹا ہے صحرائے محبت کا

۱۲

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں | جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح | تو کب تک مرے منھ کو دھوتا رہے گا؟
بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں؟ | کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا؟
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے | جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو | تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

۱۳

اللہ رے غرور و ناز تیرا! | مطلق نہیں ہم سے ساز تیرا!
ہم سے کہ تجھی کو جانتے ہیں | جاتا نہیں احتراز تیرا!
کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر | کیدھر ہے یہ امتیاز تیرا!
کہتے نہ تھے میرؔ مت کڑھا کر | دل ہو نہ گیا گداز تیرا!

۱۴

ہستی اپنی حباب کی سی ہے | یہ نمایش سراب کی سی ہے
چشم دل کھول اس ہی عالم پر | یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں | حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز | اسی خانہ خراب کی سی ہے
آتشِ غم میں دل بھنا شاید | دیر سے بو کباب کی سی ہے
دیکھیے ابر کی طرح اب کے | میری چشم پُر آب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں | ساری مستی شراب کی سی ہے

۱۵

فقیرانہ آئے صدا کر چلے | میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم | سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی — کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے مُنھ بھی چھپا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری — سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دیئے یوں کہ بیخود کیا — ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی — حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

جھڑے پھول جس رنگ گلبن سے یوں — چمن میں جہاں کے ہم آ کر چلے

نہ دیکھا غمِ دوستاں شکر ہے — ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

گئی عمر در فکرِ بندِ غزل — سو اِس فن کو ایسا بڑھا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ — جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

شیخ امام بخش ناسخ

پیدائش فیض آباد — وفات لکھنؤ ۱۲۵۴ھ

شیخ صاحب کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے۔ مگر کمال سے لاہور کو فخر کرنا چاہئے جو کہ اُن کے والد کا وطن تھا۔ خاندان کے باب میں فقط اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ یہ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ اور بعض اشخاص یہ کہتے ہیں۔ کہ اس دولتمند لاولد نے متبنّیٰ کیا تھا اصلی والد عالمِ غربت میں مشرق سے مغرب کو گئے۔ فیض آباد میں اُن کی قسمت سے یہ ستارہ چمکا۔ کہ فلکِ نظم کا آفتاب ہوا۔

"خدا کی دین کا موسےٰ سے پوچھئے احوال — کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے"

غریب باپ سے صاحب نصیب بیٹے کے سوا وہاں بھی نصیبہ نے رفاقت نہ کی۔ مگر اُس

دولت مند سوداگر نے کہ لاولد تھا۔ بلند اقبال لڑکے کو فرزندی میں لے کر ایسا تعلیم و تربیت کیا کہ بڑے ہوکر شیخ امام بخش ناسخ ہوگئے۔ اور اس مجازی باپ کی بدولت دنیا کی ضروریات سے بے نیاز رہے لکھنؤ کے دارالخلافت ہوجانے سے وہاں آئے۔ اور وہیں عمر بسر کی ٹکسال ایک محلّہ مشہور ہے۔ اُس میں بیٹھکر شعر کے چاندی سونے پر سکّہ لگاتے تھے اور کھوٹے کھرے مضمون کو پرکھتے تھے۔

فارسی کتابیں حافظ وارث علی لکھنوی سے پڑھی تھیں۔ اور علماے فرنگی محل سے بھی تحصیلی کتابیں حاصل کی تھیں۔ اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی۔ مگر رواجِ علم اور صحبت کی برکت سے فنِ شاعری کی ضروریات سے پوری واقفیت تھی۔ اور نظم سخن میں ان کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا۔ شوق ہمیشہ مشاعرہ میں لیجا کر دل میں اُمنگ اور طبیعت میں جوش بڑھاتا تھا۔ اور آسودہ حالی اکثر شعرا اہل فہم اور اہل کمال کو ان کے گھر کھینچ لاتی۔ ان کی صحبتوں میں طبیعت خود بخود اصلاح پاتی گئی۔ رفتہ رفتہ خود اصلاح دینے لگے۔

کسی کی نوکری نہیں کی۔ سرمایہ خدا داد اور جوہر شناسوں کی قدردانی سے نہایت خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ پہلی دفعہ الہ آباد میں آئے ہوئے تھے راجہ چندو لال نے ۱۲ ہزار روپئے بھیج کر بُلا بھیجا۔ اُنھوں نے لکھا کہ میں نے سیّد کا دامن پکڑا ہے۔ اُسے چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ یہاں سے جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤنگا راجہ موصوف نے پھر خط لکھا بلکہ ۱۵ ہزار روپئے بھیج کر بڑے اصرار سے کہا کہ یہاں تشریف لائیے گا۔ تو ملک الشعرا کا خطاب دلواؤں گا۔ حاضری دربار کی قید نہ ہوگی۔ ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی" انھوں نے منظور

نہ کیا۔ سنہ ۱۲۵۴ھ میں انتقال فرمایا۔ **میر علی اوسط رشک** نے تاریخ لکھی
ع "دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے" عمر میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں "۹۴-۹۵
برس کی عمر تھی۔ مولانا رعنی لکھتے ہیں۔ کہ "تقریباً ستر برس کی عمر ہوگی"

تین دیوان ہیں۔ مگر دو مشہور ہیں۔ ان میں غزلوں۔ رباعیوں۔ تاریخوں کے
سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ قصائد کا شوق نہ تھا۔ ہجو کے کانٹوں سے ان کا باغ پاک ہے۔

کلام کے خصوصیات۔ عموماً ان کا کلام شاعری کے ظاہری عیبوں اور
لفظی سقموں سے بہت پاک ہے۔ اور اس امر میں انھیں اتنی کوشش ہے۔ کہ اگرچہ
ترکیب کی چستی یا کلام کی گرمی میں فرق آجائے۔ مگر اصول ہاتھ سے نہیں جانے
دیتے۔ غزلوں میں شوکت الفاظ۔ بلند پروازی۔ نازک خیالی بہت ہے۔ اور نمک
ظرافت کا چٹخارا اور تاثیر کم۔ شوکت الفاظ کہتی ہے۔ اگر وہ قصیدہ کہتے۔ تو خوب کہتے

اس عہد تک شعرائے لکھنؤ ان استادوں کے شاگرد تھے۔ جن کا دریائے کمال
دلی کے سرچشمہ سے نکلا تھا۔ اور فصحائے لکھنؤ بھی ہر محاورے کے لئے دلی ہی
کو فخر سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ اکثر انھیں بزرگوں کے فرزند تھے۔ جنھیں زمانے کی
گردش نے اڑا کر وہاں پھینک دیا تھا۔ شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی
آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند
دی۔ اور وہی مستند ہوئی۔

ان کے چند مشہور شاگرد ہیں۔ خواجہ وزیر۔ برق۔ رشک۔ بحر۔ منیر شکوہ آبادی
نادر۔ یہ سب صاحب دیوان اور بجائے خود استاد ہیں ؎

غزلیات

دشمن سر ہے تری گردن کشی مانند شمع ... افسر زر شوق سے رکھ پہ نہ اتنا سر اٹھا
زندگی میں صرف کرتا ہو سبک دوشی حصول ... مثل تاروں خاک میں جا کر نہ بار زر اٹھا

چاہیئے تعمیرِ دل جو ساتھ اُٹھا لیجائے گا — یوں خرابی کے لیئے دیوار اُٹھایا ذرا اُٹھا
بات جن نازک مزاجوں سے نہ اُٹھتی تھی کبھی — پوچھ اُن سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اُٹھا؟
کیا سخن سنجی سے حاصل جب سخنداں ہی نہیں — زانوئے فکرت سے اے ناسخ تو اپنا سر اُٹھا

۲

مرتبہ کم حرصِ رفعت سے ہمارا ہو گیا — آفتاب ایسا ہوا اُونچا کہ تارا ہو گیا
باعثِ چاکِ کتاں ہوتا ہے جلوہ ماہ کا — واں چھپا وہ ماہ یاں دل پارہ پارہ ہو گیا
ایک درہم اور داخل گنجِ قاروں میں ہوا — پست ایسا میرے طالع کا ستارا ہو گیا
بے ثباتی جو ہوئی عالم کی ثابت اے فلک — آفتاب اپنی نظر میں اک شرارا ہو گیا

۳

میکشو! جس وقت ساقی کا کرم ہو جائیگا — پھر مرا جامِ گدائی جامِ جم ہو جائیگا
پھیر دیگا دن ہمارے جب مقلّب دہر کا — داغِ افلاس اپنے سینے میں درم ہو جائیگا
پیٹھ کے کھلنے کی علامت ہے شفق کا پھولنا — لال مجھپر وہ ہوا رونا بھی کم ہو جائیگا
شکر و شکوہ ہے سو وہ جاویگا اے ناسخ ابھی — دوست و دشمن کا وجود اک دن عدم ہو جائیگا

۴

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا — جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا
آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے — مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا
پہونچا ہے کوئی اَوجِ حقیقت کو کب اس سے؟ — واعظ ترے ممبر کا یہ زینہ نہیں اچھا
ہو سیر جو منظور دلا بحرِ جہاں کی — جز کشتیِ درویش سفینہ نہیں اچھا
ہے ہند بھلا کیا ترے رہنے کو کہ ناسخ! — مکّہ نہیں اچھا کہ مدینہ نہیں اچھا؟

۵

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر — لعل قیمت کو پہونچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

ہوتی ہے غربت میں ثروت پر پڑی ایذا کے بعد — رنج اُٹھائے کس قدر یوسف نے کنعاں چھوڑ کر
اعتماد اصلا نہیں - گر ہے جہاں زیرِ نگیں — اُٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر
آج تو پوشاک پر مرتا ہے تو کل دیکھیو — جائیگا نبّاش تیری لاش عُریاں چھوڑ کر

۶

ہیں وہ شوریدہ سر دیوانہ تھا جو بعدِ مُردن بھی — چڑھا جاتے ہیں پتھر لوگ آکر میرے مدفن پہ
ہمارے نالہا ہے پُر اثر کی طرز اُڑاتی ہے — گریباں چاک ہو گل کا نہ کیوں بلبل کے شیون پہ؟
جہاں میں تیرہ دل جو ہیں وہی بس رنج رہتے ہیں — کہ نازل ہوتی ہے آفت ہوا کی شمع روشن پہ
ہمارے زخم کے نظّارے کی کب تاب ہے اُس کو؟ — تو اے جرّاح! پہلے باندھ پٹی چشمِ سوزن پہ
کسی کا درد ہوتا ہے کسی کو کب زمانے میں؟ — کہ جام و گُل ہیں خنداں شیشۂ و بلبل کے شیون پہ
اگر ہوتا ہے اک دانہ بھی دنیا میں میری قسمت کا — فلک بجلی گرا دیتا ہے ناسخ میرے خرمن پہ

۷

خاکساروں سے ہے ہرجا سرکشوں کی سرکشی — وہ زمیں ہے کون جس پر آسماں ہوتا نہیں؟
جو سعادتمند ہیں رہتے ہیں وہ بے خانماں — دہر میں پیدا ہما کا آشیاں ہوتا نہیں -
جتنے ہیں صاحبِ سخن اُن کی طبیعت نرم ہے — ہے دلیل اسپر زباں میں استخواں ہوتا نہیں
دم ہے جب تک جسمِ عاشق میں ہے خامی کی دلیل — خوب جل جاتی ہے جو شئے پھر دھواں ہوتا نہیں
عشق کا ہو درد اے ناسخ نہ کیونکر لا دوا؟ — زخم ہے تیرِ مژگاں کا نشاں ہوتا نہیں

۸

سوائے فکر زمانے میں رسم و راہ نہیں — وہ کون جا ہے جہاں چاہ زیرِ کاہ نہیں؟
میں گو کہ حسن سے ظاہر میں مثلِ ماہ نہیں — ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں
ہوئی ہے مجھکو جرس سے یہ بات اب ثابت — شکستہ دل جو ہوا اسکے لب پہ آہ نہیں
جگر کے داغ ہیں بے لطف گر نہ ہو ناسور — جہاں میں کون ہے وہ باغ جسمیں چاہ نہیں؟

ہمیشہ کام میں غیروں کے ہیں سعادتمند — ہما کو اپنے لئے فکرِ عزّ و جاہ نہیں
ہجومِ فوجِ عدو سے جہاں میں اے ناسخ! — سوائے قلعۂ مرقد کہیں پناہ نہیں

۹

مرد وارستہ کہیں قیدِ مکاں کرتا نہیں — طائرِ نکہتِ خیال آشیاں کرتا نہیں
روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا بہرِ خلق — صبح میری شامِ غم کو آسماں کرتا نہیں
ہے ہر اک آفت سے ایمن مسکنِ اہلِ فنا — باغِ جنت کو خدا ہرگز خزاں کرتا نہیں
رحم کر عشاق پر گر چاہیئے عمرِ دراز — پیرِ گردوں طفلِ ظالم کو جواں کرتا نہیں
عیب اپنے آپ کر دیتے ہیں ہم بدمستِ فاش — شیشۂ مے جس طرح مے کو نہاں کرتا نہیں
جامِ مے میں دیکھتا ہوں میں جہاں کو مثلِ جم — گو سکندر کی طرح سیرِ جہاں کرتا نہیں

۱۰

دل میں پوشیدہ تبِ عشقِ بتاں رکھتے ہیں — آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں
نے سواری تری دیکھیں تو ہوں گردِ دنبال — ہاتھ میں صبر کی جو لوگ عناں رکھتے ہیں
بزمِ جاناں میں کبھی بات نہ نکلی منہ سے — کہنے کو شمع کے مانند زباں رکھتے ہیں
مثلِ پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس — ہم فقط تجھ پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں
طائرِ روح کو کر دیتے ہیں کیونکر بسمل؟ — تیر رکھتے ہیں پری رو نہ کماں رکھتے ہیں
تازگی ہے سخنِ کہنہ میں یہ بعدِ وفات — لوگ اکثر مرے جینے کا گماں رکھتے ہیں
عوضِ ملکِ جہاں ملکِ سخن ہے ناسخ! — گو نہیں حکم رواں طبع رواں رکھتے ہیں

۱۱

خوش قدوں کی خاک پر اٹھتی ہے ہر دم سرو قد — گرد باد اے وائے غفلت اس بیاباں میں نہیں
آج نقاشی کی چھت لگوا نہیں مانع کوئی — کل بجز خفاش لیکن سقفِ ایواں میں نہیں
دیکھنا کل آپ سے کوئی نہ رکھے گا قدم — آج جانے کی اجازت جس گلستاں میں نہیں

دوست دشمن سب کے سب ہیں رفتنی مثلِ نسیم
گُل تو کیا کانٹا بھی اک دن اس گلستاں میں نہیں

نامِ حاتم رہ گیا ہے ہو گیا برباد تخت
آدمی کیا دیو بھی مُلکِ سلیماں میں نہیں؟

مور جھیل ناداں ہلاتے ہیں کسے حیران ہوں؟
ہڈّیاں بھی تربتِ فغفور و خاقاں میں نہیں

دُم دبا جاتے تھے جن کے سامنے شیرِ ژیاں
غیرِ رُوباہ و شغال اب اُنکے ایواں میں نہیں

آمدِ موسیٰ و ہاروں کی قوی ہے یہ دلیل
کون سا فرعون ہے جو فکرِ ساماں میں نہیں

جو ترا جی چاہتا ہے بس وہی کرتا ہے تو
وہ پری ہے تو کہ فرمانِ سلیماں میں نہیں

بے وطن ہو کر زمانے میں ہوئے نالاں بشر
آشنا نالوں سے ہرگز نَے نیستاں میں نہیں

مثلِ مجنوں کس لئے صحرا بہ صحرا ہے خراب؟
کیا رسائی تجکو ناصح! کوئے جاناں میں نہیں

۱۲

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں؟
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

عبرت کی جا ہے لاکھوں ہی طفل و جواں نہیں
پیری میں بھی خیالِ اجل کا یہاں نہیں

ہر گُل ہے اس چمن سے گریباں بہ رنگ بُو
سروِ چمن ہے کون جو سرو رواں نہیں

آنکھوں سے فائدہ جو نہیں تیری گرد راہ
حاصل جبیں سے کیا جو ترا آستاں نہیں

حاصل تجھے بصارتِ یعقوب ہو اگر
یوسف بغیر کوئی یہاں کا رواں نہیں

منعم کے شکم میں بھی بلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

زردار جو ہیں کیوں نہ ہوں خنداں برنگِ گُل؟
باغِ جہاں میں زر بھی کم از زعفراں نہیں

جن کے سروں پہ آپ نگوں سار رہے ہما
اُن کا لحد میں آج کوئی استخواں نہیں

۱۳

یہ جسمِ زار ہے یوں پیرہن کے پردے میں
کہ جیسے رُوح نہاں ہے بدن کے پردے میں

سوائے اہلِ سخن ہو مشاہدہ کس کو؟ نہاں ہے شاہدِ معنی سخن کے پردے میں
تلاش جسکی ہے دن رات تجکو اے غافل! چھپا ہوا ہے وہ تیرے ہی تن کے پردے میں
جو عندلیب کی آنکھوں سے دیکھے اور سمجھے ظہور ہے اسی گل کا چمن کے پردے میں
چمن میں لائی صبا کس کی بو جو آج شمیم؟ دمک رہی ہے گل یاسمن کے پردے میں
خبر نہ شامِ غریبی کی مجکو تھی ناسخ! چھپی ہوئی تھی یہ صبحِ وطن کے پردے میں

۱۴

بیاں کیا ہو سکے عمرِ رواں کی تجھ سے چالاکی؟ کہ اس توسن سے لگا ہے نہ تُرکی کو نہ تازی کو
اکیلا دل مرا فوجِ تمنا کے مقابل ہے الٰہی! بھیجیو تو فتح باب اس مردِ غازی کو
ثمر پختہ جو ہے اے خام طبعو! باغِ عالم میں نہ کیونکر خاکساری سے وہ بدلے سرفرازی کو

۱۵

اجل سر پہ کھڑی ہے خوابِ غفلت میں زمانہ ہے چھپر کھٹ کے عوض لازم جنازے کا بنانا ہے
دکھا دیتا ہے کافورِ سحر روز آسماں سب کو ولیکن غافل اپنے غسلِ میت سے زمانہ ہے
میں وہ ہوں مردۂ بیکس کہ میری قبر کے اوپر بنے ہے برق جھالر ابرِ رحمت شامیانہ ہے
نہ ہوگا مزرعِ اعمالِ زاہد بارور ہرگز کہ سرسبزی سے ہے محروم سبحہ کا جو دانہ ہے
جو مالک گنج و زر کا ہو بجا ہے سرکشی اسکو کہ فوارے کو دیکھو پاس پانی کا خزانہ ہے
ہوا ثابت جو دیکھا اژدھا و گنج کو باہم جو موذی ہیں ہمیشہ انکے کیسے میں خزانہ ہے
غبارِ راہ ہم سمجھیں نہ کیونکر جسمِ خاکی کو؟ رگِ جاں توسنِ عمرِ رواں کو تازیانہ ہے
نکلتا ہے جو ہر گل زر بکف گلزارِ عالم میں خدا جانے زمیں میں دفن یہ کیسا خزانہ ہے
اشارہ آمد و رفتِ نفس کا ہے یہی ہر دم بدن میں دم جو آیا ہے مقرر اسکو جانا ہے

کمی ہوتی نہیں نقدِ سخن کی یاں کبھی ناسخ!
ازل سے اپنے قابو میں معانی کا خزانہ ہے

۱۶

طالبِ دیدار جسکا ہے ولا! وہ تجھ میں ہے — جلوۂ برقِ تجلّی تھا شرارِ طُور سے
خلق کے اعمال بد کرتے ہیں ایسا انقلاب — جائے آتش جوش پانی کا ہوا تنّور سے
منعمِ مُوذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں — مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور سے
بانٹ لے کوئی کسی کا درد یہ ممکن نہیں — بارِ غم دنیا میں اُٹھوانے نہیں مزدور سے
دیکھتا ہوں جب کلام اُسکا بہت آتا ہے یاد — اُنس تھا مجکو نہایت ناسخؔ مغفور سے
دیکھنا اے اہلِ عبرت! انتقامِ آسماں — بِکتے ہیں جامِ گدا خاکِ سرِ فغفور سے

۱۷

تَوسنِ عمرِ رواں ایسا ہی گر چالاک ہے — گردساں برباد اک دن میری مشتِ خاک ہے
آئنے کو دوست رکھتے ہیں جہاں کے خوب و زشت — دل ہوا جب صاف تب عالم سے جھگڑا پاک ہے
اسفل و اعلیٰ جو ہیں مِل جائیں گے سب خاک میں — آسماں اِس رتبۂ عالی پہ زیرِ خاک ہے
پست تر کرنے کو گردوں سب کو کرتا ہے بلند — اشک بھی اِس رتبۂ عالی پہ زیرِ خاک ہے
رُوح ہے ہر جسم میں مشتاقِ اخبارِ اجل — اس لیئے یہ آمد و رفتِ نفس کی ڈاک ہے

۱۸

کیا ہوں اشکوں سے مرے دیدۂ بینا خالی؟ — غمِ فرقت سے نہیں ہے کوئی سینہ خالی
قلزمِ دہر میں رکھتا ہے تجرّد محفوظ — غرق کم ہوتا ہے دریا میں سفینہ خالی
کبھی ہوگی نہ یہاں گنجِ معانی کی کمی — ورنہ ہو صرف سے قاروں کا خزانہ خالی
ایک کے نفع سے ہے ایک کو نقصان یہاں — جام بھر جائے جو ساقی تو ہو مینا خالی

کیا بھلا مہر و محبت کو جگہ ہو ناسخؔ!
یار کے سینے کو کرتا نہیں کینہ خالی

خواجہ حیدر علی آتش

پیدائش دلّی — وفات لکھنؤ ۱۲۶۳ھ

آتش۔ تخلص۔ خواجہ حیدر علی نام۔ آپ دلّی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں جاکر سکونت اختیار کی۔ خواجہ زادوں کا خاندان تھا۔ جس میں مسند فقر بھی قایم تھی۔ اور سلسلہ پیری مریدی کا بھی تھا۔ مگر شاعری بھی اختیار کی۔ اور خاندانی طریقہ کو سلام کرکے اس میں سے فقط آزادی و بے پروائی کو رفاقت میں لے لیا مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ ان کی آتش بیانی نے اُستاد کے نام کو روشن کیا۔ بلکہ کلام کی گرمی اور چمک کی دمک نے اُستاد شاگرد کے کلام میں اندھیرے اُجالے کا امتیاز دکھایا۔

علمی استعداد معمولی تھی مشق کی کثرت سے اپنے زمانے میں مسلّم الثبوت اُستاد ہوگئے۔ اور سیکڑوں شاگرد مثل میر وزیر علی صبا۔ رند۔ خلیل جلیل۔ شنا ور سہیل نادر مرزا کے ان کے دامن تربیت میں پرورش پاکر اُستاد کہلائے۔

۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی ع "خواجہ حیدر علی اے وا مردند"

تمام عمر کی کمائی جسے حیات جاودانی کا مول کہنا چاہیئے۔ ایک دیوان غزلوں کا ہے۔ جو کہ ان کے سامنے رائج ہوگیا تھا۔ دوسرا تتمّہ ہے۔ کہ پیچھے مرتب ہوا۔ جو کلام ان کا ہے۔ حقیقت میں محاورہ اُردو کا دستور العمل ہے۔ اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفاے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے شعر کہدیئے ہیں۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی۔ ان کا کلام مضامین بلند سے

خالی نہیں - طرز بیان صاف ہے - سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے - ترکیبوں میں استعارے اور تشبیہیں فارسیت کی بھی موجود ہیں - مگر قریب الفہم -

غزلیات

عاجز نواز دوسرا تجھ سا نہیں کوئی — رنجور کا انیس ہے ہمدم علیل کا
باغ و بہار آتشِ نمرود کو کیا — مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا
موسےٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی — فرعون کو تو نے غرق کیا رُودِ نیل کا
طوفاں میں ناخدائی کشتیِ نوح کی — حقّا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا
سائل ہوں مجکو قید کم و بیش کی نہیں — مختار ہے کریم کثیر و قلیل کا
دیکھا تو خار و گل کا مقام ایک شاخ ہے — دل توڑتا نہیں تو عزیز و ذلیل کا
آتش یہی دعا ہے خدائے کریم سے — محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا

۲

محبت کا تری بندہ ہر اک کو اے صنم! پایا — برابر گردنِ شاہ و گدا دونوں کو خم پایا
برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں — تو اُس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا
نشانہ تیرِ ہمّت کا ہے میرا اخترِ طالع — اُٹھاؤں داغ میں تو آسماں سمجھے درم پایا
ہزاروں حسرتیں جا دینگی میرے ساتھ دُنیا سے — شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اِس خرابے میں — غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا
نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں — صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا
جلایا اور مارا حُسن کی نیرنگ سازی نے — کبھی برقِ غضب اُس کو کبھی ابرِ کرم پایا
فراق انجام کار آغازِ وصلت کا بلاشک ہے — بہت رُویا میں رُوحِ وتن کو جب مشتاق ہم پایا
ہوا ہرگز نہ خطِ شوق کا ساماں درست آتش — سیاہی ہو گئی نایاب اگر ہم نے قلم پایا

۳

حسنِ پری اِک جلوۂ مستانہ ہے اُسکا — ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُسکا
وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اُس میں — معمورۂ عالم ہے جو ویرانہ ہے اُسکا
جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی — جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُسکا
دل قصرِ شہنشہ ہے وہ شوخ اُسمیں شہنشاہ — عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اُسکا
وہ یاد ہے اُس کی کہ بھلادے دو جہاں کو — حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُسکا
یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے — قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُسکا
آوارگیٔ نکہتِ گل سے ہے یہ اشارہ — جامہ سے وہ باہر ہے جو دیوانہ ہے اُسکا
یہ حال ہوا اُس کے فقیروں سے ہویدا — آلودۂ دُنیا جو ہے بیگانہ ہے اُسکا
شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش — لبریز مے شوق سے پیمانہ ہے اُسکا

۴

حبابِ آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا — نہایت غم ہے اِس قطرہ کو دریا کی جدائی کا
تعلق رُوح سے مجکو جسد کا ناگوارا ہے — زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا
ہوئی منظور محتاجی نہ مجکو اپنے سائل کی — بنایا کاسۂ سر و اژگوں کاسہ گدائی کا
نکل اے جان اِتن سے تا وصالِ یار حاصل ہو — چمن کی سیر ہے انجام بلبل کو رہائی کا
شکستِ خاطرِ احباب ہوتی ہے درست اِس سے — توجہ میں تری اے یار اثر ہے مومیائی کا
نظر آتی ہیں ہر سُو صورتیں ہی صورتیں مجکو — کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا
دل اپنا آئنہ سے صاف عشقِ پاک رکھتا ہے — تماشا دیکھتا ہے حُسن اِس میں خود نمائی کا
نہیں دیکھا ہے لیکن مجکو پہچانا ہے آتش نے — بجا ہے اے صنم! جو مجکو دعویٰ ہے خدائی کا

۵

غبارِ راہ ہو کر چشمِ مردم میں محل پایا — نہالِ خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

برنگِ شمع ہم دل سوختوں نے بزمِ عالم میں / زباں کھولی نہ لیکن بات کرنے کا محل پایا
شکستہ دل ہوا انساں عوض ہر شے کا ملتا ہے / مُوا فرزند اگر تو داغِ دل نعم البدل پایا
رعونت کون سی شے پر ہے اِن عزلت گزینوں کو / حصیرِ کہنہ دیکھا دستِ خشک و پائے شل پایا
غضب ہے منزلِ ہستی میں آسائش طلب ہونا / ہجومِ خواب سے رہرو نے آخر کو خلل پایا
ہمیشہ جوشِ گریہ سے رہا پانی میں اے آتش / کبھی تازہ نہ لیکن اپنے دل کا یہ کنول پایا

۶

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ / کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف / قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا؟
اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر / مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟
چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر / دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا؟
صیاد اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب / دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے دام و دانہ کیا؟
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال / ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟
آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو؟ / دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا؟
ہوتا ہے زرد سن کے جو نا مرد مدعی / رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا؟
صیاد گل عذار دکھاتا ہے سیرِ باغ / بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا؟
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے / آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا؟

۷

فریب کو دلِ اہلِ صفا میں راہ نہیں / وہ دشت ہے کہ جہاں چاہِ زیرِ کاہ نہیں
بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں / حواسِ خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں
صدا یہ قبر سے بیدار دل کے آتی ہے / عمل جو نیک ہوں تو ایسی خوابگاہ نہیں
عذابِ گور ہے دنیا کے رنج سے بدتر / سوا خدا کے کرم کے کہیں پناہ نہیں

فقیرِ بن کے قدم اس میں مار آسے آتشؔ ! طریقِ احمدِ مرسل ہے شاہراہ نہیں

۸

جانبِ دشتِ عدم خیمہ رواں کرنے دو وحشتِ دل کو علاجِ خفقاں کرنے دو

سوزِ دل میری طرح سے نہ بیاں ہووےگا شمع کافور کو بھی چرب زباں کرنے دو

کوہِ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کم ظرفی ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو

سامنے آ ہی گیا لشکرِ اندوہ و ملال اب تو سیدھی مری آنکھوں کو سناں کرنے دو

آخرِ کار تہِ خاک ہے مسکن سب کا اہلِ دولت کو بلند آج مکاں کرنے دو

چھوٹ بہنے دو انھیں پار کے آگے آتشؔ ! دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو

۹

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں زہر کھا کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

عقل کر دیتی ہے انساں کی جہالت زائل موت سے جاں چھپانے کو سپر لیتا ہے

غیرتِ نالۂ و فریاد نہ کھوائے آتشؔ ! آشنا کوئی نہیں کون خبر لیتا ہے

۱۰

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے؟ زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے

خدا پنہاں ہے عالم آشکارا نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے

دلِ روشن ہے روشن گر کی منزل یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

بہ رنگِ بو ہوں گلشن میں میں بلبل بغل غنچہ کی میرا آشیاں ہے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

بہت آتا ہے یاد اے عنبرِ مشکیں! — خدا خوش رکھے تجھکو تو جہاں ہے
تعلّق ہوتا ہے خوشبو سے اُس کی — کسی گلِ رو کا غنچہ عطرداں ہے
وطن میں اپنے اہلِ شوق کی طرح — سفر میں روز و شب ریگِ رواں ہے
سحر ہووے کہیں شبنم کرے کوچ — گل و بلبل کے دریا درمیاں ہے
سعادت مند قسمت پہ ہیں شاکر — ہما کو مغز یا دامِ استخواں ہے
جرس کے ساتھ دل رہتے ہیں نالاں — مرے یوسف کا عاشق کارواں ہے
قدِ محبوب کو شاعر کہیں سرو — قیامت کا یہ اے آتش! زباں ہے

۱۱

بازارِ دہر میں تری منزل کہاں نہ تھی؟ — یوسف نہ جس میں ہو کوئی ایسی دکاں نہ تھی
منزل ہی دور ہے جو یہ پہونچی نہیں ہنوز — دم لینے والی راہ میں عمرِ رواں نہ تھی
دکھلائے سیر آنکھوں کو بامِ مراد کی — ایسی کوئی کمند کوئی نردباں نہ تھی
رہ جانا پیچھے جسم کا جاں سے عجب نہیں — کس کارواں کی گرد پسِ کارواں نہ تھی
نافہمی کی دلیل ہے یہ سجدہ سے اِبا — ابلیس کو حقیقتِ آدم عیاں نہ تھی
افسوس کیا جوانیِ رفتہ کا کیجیے — وہ کون سی بہار تھی جسکو خزاں نہ تھی
نالوں سے ایک دن نہ گئے گرمِ گوشِ یار — آتش مگر تمھارے دہن میں زباں نہ تھی

۱۲

مسافر کی طرح رہ خانہ بر دوش — نہیں جائے اقامت دارِ فانی
یقیں ہے دیدۂ باریک بیں کو — کرے عینک طلب یہ ناتوانی
یہ مُشتِ خاک ہو مقبولِ درگاہ — صبا کی چاہتا ہوں مہربانی
سفیدی مو کی ہو کافور ہر چند — کوئی چھٹتا ہے داغِ نوجوانی؟
نہ خوش ہو فربہیِ تن سے غافل — شتاب کرتی ہے مُردے کو گرانی

موے جو پیشتر مرنے سے وہ لوگ — کفن سمجھے قبائے زندگانی
ہوا کوئی نہ حال دل سے آگاہ — رہی مشتاقِ گوش اپنی کہانی
خدا کے حکم سے ہے قوّتِ نطق — کلام اپنا ہے ہاتف کی زبانی
مرا دیوان ملے اسے آتش بخزانہ — ہر اک بیت اس میں ہے گنجِ معانی

خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق

پیدائش دلّی سنہ ۱۲۰۴ھ — وفات دلّی سنہ ۱۲۷۱ھ

شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے۔ جو ایک غریب سپاہی تھے ۱۱۔ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ دلّی میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً حافظ غلام رسول صاحب شوق سے پڑھتے تھے۔ انھیں کی خدمت میں شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ اسی محلہ میں میر کاظم حسین صاحب بیقرار ایک اِن کے ہم سبق تھے۔ وہ بھی حافظ غلام رسول صاحب سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ ایک غزل لکھکر لائے۔ غزل اچھی تھی۔ شیخ نے سنکر کہا کہ "خوب شعر نکالے ہیں" اُنھوں نے کہا کہ "ہم شاہ نصیر کے شاگرد ہوگئے"۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق ہوا۔ اُن کے ساتھ جاکر شاگرد ہوگئے برابر اصلاح لیتے رہے۔ ایک بار مرزا رفیع السودا کی غزل پر غزل کہی۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ انھوں نے خفا ہوکر غزل پھینک دی۔ کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے۔ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا"۔ یہ وہاں سے چپکے چلے آئے۔ اُس دن سے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ خود کہتے اور مشاعروں میں پڑھتے یہاں تک کہ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں پر اثر برق کی طرح دوڑی۔ اور کلام کا چرچا بڑھا۔

اکبر شاہ کے ولی عہد مرزا ابو ظفر کہ بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے۔ شعر کے شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ دربار

شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے سب وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ میر کاظم حسین بیقرار ولیعہد کے ملازم خاص تھے۔ ان کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہونچے۔ اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے۔ شاہ نصیر کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ **دکن** چلے گئے۔ میر کاظم حسین صاحب میر منشی ہوکر **شکارپور سندھ** وغیرہ چلے گئے۔ چند روز کے بعد ایک دن ولیعہد نے ایک غزل جیب سے نکال کر دی۔ کہ "ذرا اسے بنا دو" یہ وہیں بیٹھ گئے۔ اور غزل بنا کر سنائی۔ **ولیعہد بہادر** بہت خوش ہوئے۔ اور کہا کہ "بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو" پھر برابر انھیں سے اصلاح لیتے رہے۔ چند سال کے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہکر سنایا۔ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کئے تھے۔ مطلع اس کا یہ تھا۔

"جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن　　　　آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن"

اس پر بادشاہ نے **خاقانی ہند** کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت **شیخ** مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

جب مرزا ابوظفر بادشاہ ہوکر **بہادر شاہ** ہوئے۔ تو پہلے انھوں نے قصیدہ گذرانا اس پر تنخواہ میں ایک معتدبہ اضافہ ہوا۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی۔ اور انھوں نے ایک قصیدہ غرا کہکر نذر گذرانا۔ تو خلعت کے علاوہ خطاب **خاقانی بہادر** اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گذرانا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔ ع۔ "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" اس پر ایک گانوں جاگیر میں عطا ہوا۔

۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا۔ کہ ۱۷ دن بیمار رہکر وفات پائی۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا۔

"کہتے ہیں آج **ذوق** جہاں سے گذر گیا　　　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے"

علوم متداولہ میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ تصوّف خوب جانتے تھے۔ نجوم رمل موسیقی میں
بھی دخل تھا۔ غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی
مضمون صفائی کلام چستی ترکیب۔ خوبی محاورہ ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف
وقتوں میں مختلف رہا۔ قصائد میں اصلی میلان ان کی طبیعت کا **سودا** کے انداز پر
زیادہ تھا۔ سودا کے بعد **شیخ** مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا۔

کلام کو دیکھکر یہ عام انداز معلوم ہوتا ہے۔ کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے
ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے اُنھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پہ بٹھایا ہے
کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انھیں قادر کلامی کے دربار سے مُلکِ سخن پر حکومت
مل گئی۔ کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں۔ کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے
رنگ سے سجاکر استعارہ کی بُو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے
ہیں۔ مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے۔ اور مُنہ سے کبھی
واہ اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ
لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جسے جہاں سجتا
دیکھتے ہیں۔ وہ گویا وہیں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت
کو پہچانتے تھے۔ کہ کون ہے۔ کہ سادگی میں رنگ دے جائے گا۔ اور کون رنگینی میں۔
کامل مصوّر کی تیزی قلم کو اُس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اِسی طرح اُن کے
مضمون کی باریکی کو اُن کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ اُنھیں اِس بات کا
کمال تھا۔ کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اِس
صفائی سے ادا کر جاتے تھے۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا۔ کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا
ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتے۔
جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے ہر ایک
شخص کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور دل پہ اثر بھی کرتا ہے۔

قصیدہ

مرزا ابو ظفر بہادر شاہ نے عالمِ ولیعہدی میں بیماری کے بعد غسل صحت کیا تھا۔ اس کی مبارکباد میں یہ قصیدہ لکھا گیا تھا۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا ‖ مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا
بھر گئی ہے کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار ‖ بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر ‖ شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق ‖ لالہ کے داغِ سیہ پانے لگا نشو و نما
ہو گیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں ‖ بیدِ مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو ‖ برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگِ حنا
پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں ‖ زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں ‖ چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
نام کو اشیا میں نے تلخی رہی نے سمیت ‖ بن گئی تریاک افیون زہر میٹھا ہو گیا
کیا عجب حلوا کی تاثیر گر رکھے زقوم ‖ کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا
نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں ‖ کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلہ
راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دور ‖ چاہیے واقف نہ ہو دورانِ سر سے آسیا
موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف ‖ آب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا
آ گیا اصلاح پہ ایسا زمانے کا مزاج ‖ تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
نسخہ پہ لکھنے نہیں پاتا ہو اشتافی طبیب ‖ کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا
فرق سے تا پا یاں تک اعضائے بدن سے درد کے ‖ درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی سب ہیں جدا
لاغری کو ہو کمالِ تاب و طاقت پہ شتاب ‖ جیسے دو ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدر الدجا

صبحِ صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آ گئی ق لیکن اِس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

بھوک کی شدّت سے اُس کو اِک نفس فرصت نہو — قرص سے خورشید کے جب تک نہ کرلے ناشتا

رات بھر ٹوٹنگا کیا انجم کے دانے چرخِ پیر — پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

پہونچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانے میں — لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرّ نا

کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے؟ — جوں حباب اسکے نہیں مطلق شکم میں امتلا

ہضمِ کامل اِس قدر معدہ نے پہونچایا بہم — جیّدِ الکیموس ہے جو حلق سے اُتری غذا

ہے مزاجِ اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال — ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخطِ استوا

رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس؟ — باغِ عالم میں بہی عالم جو صحّت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بادِ پر سے سارے نقش دھو — پھینکدے گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختہ

اِس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج — نام گلشن میں نہیں ہے نرگسِ بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحّت نہ اِک عالم کو ہو؟ — جب کہ ہو اُس کی نویدِ غسلِ صحّت جاں فزا

وہ ولی عہدِ زماں مرزا محمّد بو ظفر — اُس کی قوّت گر ضعیفوں کو بنادے اقویا

تقویت کا یہ اثر ہو عام - جو ہیں برگِ زرد — ہوں مقوّیِ دل و جاں مثلِ اوراقِ طلا

شادیِ صحّت سے اُسکی آج ہو کر شاد شاد — تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

میں بھی اِس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں — بلبلِ تصویر سنکر بول اُٹھے مرحبا

مطلعِ دوم

آج ہے عالم میں وہ روزِ سعادت انتماء — دے اگر زاغ و زغن بیضہ تو پیدا ہو ہما

مژدۂ جاں بخش صحّت ہے نرا ماء الحیاتؔ — جس سے جوں سیماب کشتہ مُردہ دل زندہ ہوا

ہے بقاے عمر سے تیری بقاے عمرِ خلق — ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آبِ بقا

قطرہ افشانی سے آبِ غسلِ صحّت کے ترے — ہوں دُرِ خوش آب پیدا اِس قدر قوّت فزا

ہووے استعمالِ یاقوتی میں وہ موتی اگر
بخشے پیرانِ کہن کو تو جوانوں کے قویٰ

جسم کو کل کے دھویا تو نے جس دم وقتِ غسل
گردِ کلفت کو دلِ عالم سے گویا دھو دیا

دلِ عدوِ سنگدل کا تھا شقاوت سے جو سخت
زیرِ پا پامال ہوتا تھا برنگِ سنگِ پا

خوردۂ دل کو صبا لائی تصدق کے لئے
دے گیا ابرِ بہاری نذر دُرِّ بے بہا

شادیِ صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج؟
جوشِ عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

چھیڑے تارِ شمع کو گر ناخنِ موجِ نسیم
بزم میں پیدا ہو تارِ سازِ طرب کی صدا

لب پہ ساغر کے ہے جوں موجِ تبسم موجِ مے
شورِ قلقل لب پہ ہے مینائے مے کے قہقہا

بزمِ تصویرات فانوسِ خیالی کی طرح
حلقۂ رقاصگاں ہے زیرِ گردوں جابجا

کر رہا صحنِ چمن ہی میں ہے کیا طاؤس رقص؟
آشیانہ میں ہے رقصاں طائرِ قبلہ نما

خانہ ہائے چشم میں بھی پتلیوں کا رقص ہے
ہے جو منظورِ نظر سب کو تماشا رقص کا

چھوٹی آتش بازی ایسی جس کی گلکاری کو دیکھ (ق)
رات کو کہتے تھے آپس میں ثریا و سُہا

صنعِ آتش باز پر حیرت زدہ ہوتی ہے عقل
سنگہا پارس سے کہیں بارود کو پیسا ہے کیا؟

ہو گئی تاثیر اس کی یہ کہ ہر گُل ریزہ سے
ریزۂ فولاد نکلے بن کے گلہائے طلا

گنج چھٹتے تھے ستاروں کے عجب انداز سے
ماہ پاروں کا تھا گویا خندۂ دنداں نما

منہ سے ہے کیا جو رنگ سے مہتاب کے مہتاب ہو؟
غازہ سے ہر چند چمکے رنگِ روئے مہ لقا

برج جو اُڑتے ہوئے قندیلِ شب زیرِ فلک
برج تھے چلتے فلک پر سب کو روشن کر دیا

فی الحقیقت ہے وہ شادی ہے کہ اس کے روبرو
جشنِ جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا

ہے زبانِ خامہ عاجز آ گئے بس تعریف میں
ذوقؔ کہتا ہے اُٹھا کر ذوق میں دستِ دعا

رکھے صحت سے ہمیشہ شافیِ مطلق تجھے
جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

قصیدۂ مسدس دعائیہ

سر پہ آرائے گردوں جب تلک سلطانِ خاور ہو
قمر دستورِ اعظم صدرِ اعلے سعدِ اکبر ہو
عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو
زحل میر عمارت ترک گردوں میرِ لشکر ہو
سرِ ہفت آسماں جب تک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہ ہفت کشور ہو

رہے نام سلیماں تا نگینِ حکمرانی سے
رہے نام فریدوں تا درفشِ کاویانی سے
رہے دارا کو تا نام آوری تاجِ کیانی سے
سکندر تا ہو نامی سکۂ کشورستانی سے
ترا اے خسروِ والا حشم عالم مسخر ہو
سرِ پر سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

بخارِ ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی
رواں پانی سے تا دریا ہو اور دریا کو طغیانی
زمیں میں تا ہو کان اور کان میں ہو جوہرِ کانی
سپے جوہر ہو قیمت اور قیمت کو فراوانی
تری شمشیر جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضہ میں بحرِ پر گہر اور کانِ پر زر ہو

رکھیں تا عود کو آتش پہ اور آتش کو مجمر میں
گلِ تر تا ہو گلدان میں تری ہو تا گلِ تر میں
رہے نافہ میں مشکِ اذفر اور بو مشکِ اذفر میں
صدف میں تا ہو گوہر اور رہو تا آب گوہر میں
ترے ابرِ کرم سے باغِ عالم تازہ و تر ہو
شمیمِ خلق سے تیرے جہاں یکسر معطر ہو

طریقِ رہبری میں خضر ہو جب تک ہدایت فن
سہارا ہووے تا بہرِ غریق الیاس کا دامن
رہے ادریس تا قطعِ تعلق سے جناں مسکن
مسیحا کا ہو بالاخانہ تا خورشید سے روشن
چراغِ عمر سے تیرے جہاں سارا منور ہو
فروغِ اسلام کو ہو رونقِ دینِ پیمبر ہو

شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو
کرے آراستہ تا شام اپنے مو سے گیسو کو
ثریا نورتن تا کہکشاں کے ہووے بازو کو
کرے وسمہ سے تا قوسِ قزح سیر اپنے ابرو کو
لبِ پاں خوردہ دشمن کے لہو سے تیرا خنجر ہو
سرِ بدخواہ فندق تیرے انگشتِ سناں پر ہو

گلستاں میں ہو تا گل اور گل سے شاخ ہو زیبا
نیستاں میں ہو تا نے اور نے سے نغمہ ہو پیدا

نہالِ تاک میں انگور ہو انگور میں صہبا
نشہ صہبا میں ہو اور ہو نشہ جب تک نشاط افزا

شرابِ عیش سے خالی کبھی تیرا نہ ساغر ہو
ہمیشہ جشنِ جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو

قلم تا راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفا آئین
قلم زن تا ہو مشک افشاں کاغذ خط سے مشک آگیں

زباں پہ تا سخن ہو اور سخن میں معنی رنگیں
سخن تا داد چاہے اور تا اہلِ سخن تحسیں

ترا مداح دائم خسروا ذوقِ سخنور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دعا گو ہو ثنا گر ہو

سہرا

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جوان بخت اُن کے بیٹے تھے۔ اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے اُن کی ولیعہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے بیگم کے ایما سے **غالب** مرحوم نے یہ سہرا کہکر زرنگار کاغذ پر لکھکر ایک سونے کی کشتی میں رکھکر بڑے تکلّف کے ساتھ حضور میں گذرانا۔

خوش ہو اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ!
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اِس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رُک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جب کہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا؟

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا؟

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھکر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ ذوق مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ استاد اسے تو دیکھو انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیرو مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہدو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھدو۔ اور کہا کہ مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی حضور دیکھا۔ غرض بیٹھ گئے۔ اور عرض کیا۔

اے جواں بخت! مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے "صلِّ علیٰ" یہ کہے "سبحان اللہ"
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھکر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرایش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

ایک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطّر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظّارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جن کو دعوےٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو — دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مرزا بڑے ادا شناس تھے۔ جب اُن کو اس کی خبر ہوئی۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہوگیا کچھ اور۔ یہ قطعہ کہکر حضور میں گذرانا۔ سب طرف سے تعریفیں ہوئیں۔

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سَو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال! — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہی کی حاجت نہیں مجھے
مَیں کون اور ریختہ؟ ہاں اِس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اِس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

غزلیات

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انسان کو سگِ دُنیا نہ پایا — فرشتہ اُس کا ہمپایہ نہ پایا
مقدر ہی پہ گر سُود و زیاں ہے — تو ہاں ہم نے نہ کچھ کھویا نہ پایا
سُراغِ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے؟ — کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا

کرے کیا سیر دل ملکِ فنا کی؟ — کہ اس بازار میں سودا نہ پایا
رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا — غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا
رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
فلک کے گنبدِ بے در سے ہم تو — نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
چراغِ داغ لے کر دل میں ڈھونڈا — اثر پر صبر و طاقت کا نہ پایا
وہ از خود رفتہ ہوں جسکو خودی نے — خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا
یہی ہر دم ہے زخمِ دل کا رونا — دہن پایا لبِ گویا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم — غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا
نظیر اسکا کہاں عالم میں اے ذوق — کہیں ایسا نہ پاوے گا نہ پایا

۲

مرے سینہ سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا — دہانِ زخم سے خوں ہو کے حرفِ آرزو نکلا
مرا گھر تیری منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع؟ — خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہرو نکلا
پھرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہی سرگرداں — اگر خورشید نکلا تیرا گرمِ جستجو نکلا
مئے عشرت کا تھا خمخانۂ افلاک پر دھوکا — کہ تھا لبریز غم اس خمکدہ سے جو سبو نکلا
کہیں تجھکو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا — پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں تو نکلا
خجل اپنے گناہوں سے ہوں یاں تک میں کہ جب رویا — تو جو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سرخرو نکلا
گھسے سب ناخنِ تدبیر اور ٹوٹی سرِ سوزن — مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ ہرگز وہ کبھو نکلا
اسے عیار پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو — جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا

۳

لکھیے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا — پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورتِ تصویر نہالی
کیا اُٹھے سرِ بسترِ غم اُٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلےٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

جوں دانۂ روئیدہ تہِ خاک ہمارا
سر زیرِ گرانبارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

ہر داغِ معاصی مرا اُس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احسان
سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا

پردہ درِ کعبہ سے اُٹھانا تو ہے آسان
پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گراں بار ہے؟ جوزادِ سفر بھی
اے راہروِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوقؔ؟
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

۴

نالہ کہتا ہے کہ "تا چرخِ زحل جاؤں گا
بلکہ میں توڑ کے اُسکو بھی نکل جاؤں گا

آج اگر راہ نہ پاؤں گا تو کل جاؤں گا
کوچۂ یار میں پر سر ہی کے بل جاؤں گا"

دل سے کہتا ہوں کہ "تو ساتھ نہ لیجا مجھکو
جا کے میں واں ترے قابو سے نکل جاؤں گا

مدرسہ میں بھی اگر جاؤنگا تو جائے کتاب
شیشۂ بادہ لئے زیرِ بغل جاؤں گا"

دل یہ کہتا ہے "مجھے سینۂ روزن سے نکال
ورنہ خوں ہو کے میں آنکھوں سے نکل جاؤں گا"

آنکھ سے اشک صفت مجھکو گرا کر نہ اُٹھا
دل نہیں ہیں کہ سنبھالے سے سنبھل جاؤں گا

گر پڑا آگ میں پروانہ دمِ گرمیِ شوق
سمجھا اتنا بھی نہ کم بخت کہ جل جاؤں گا

کہتا پیراہنِ گل ہے یہ نزاکت سے نسیم
"ہاتھ مجھکو نہ لگانا کہ نکل جاؤں گا"

سنتے ہو زاہد و ناصح جو ہیں سمجھاتے مجھے
کیا بدل دیویں گے یہ اور میں بدل جاؤں گا

میں وہ مشتاقِ شہادت ہوں کہ سر دینے کو
پاسے گو یاں تہِ شمشیرِ اجل جاؤں گا

جنبشِ برگ صفت باغِ جہاں میں اے ذوقؔ
کچھ نہ ہاتھ آئے گا تو ہاتھ تو مل جاؤں گا

۵

ابر کیا ہے؟ آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — برق کیا ہے؟ تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

پوچھے ملّا سے۔ جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا — سیکھے۔ گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیر و پیکاں جتنے دل میں تھے۔ دیے ہمنے نکال — اپنے ہاتھوں گھر لٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

دیکھ کر قاتل کو بھر لائے خراشِ دل میں خوں — سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

خط میں لکھوا کر انھیں بھیجا تو مطلع درد کا — دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی۔ گر پڑے ہم آپ سے — دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جب کہا "مرتا ہوں"۔ وہ بولے مرا سر کاٹ کر — جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں چلے ابرو۔ یہاں چھری گلے پر ہمنے تیغ — بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سن کر آمد اُن کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم — پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہمنے پہلے ہی کہا تھا "تو کرے گا ہم کو قتل" — تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو سکھایا اپنی قسمت نے۔ وگرنہ اُسکو غیر — کیا سکھائے گا سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوقؔ ہیں جوں مردمک ہم روسیاہ؟ — لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

۲

سر بوقتِ ذبح اپنا۔ اُس کے زیرِ پائے ہے — یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

رخصت اے زنداں! جنوں! زنجیر در کھڑکاتے ہے — مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

واہ وا شورِ محبت! خوب ہی چھڑکا نمک! — استخواں میرا ہما کس مزے سے کھائے ہے

دم کی ہے سینہ میں گر ضعف سے یہ گفتگو — دیکھیے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بس کر م سوزِ دروں! اٹھیں جائیں گے دل اور جگر — رحم جوشِ گریہ! چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے

بل بے استغنا کہ! وہ یاں آتے آتے رہ گئے — اف ری بیتابی! کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

تو نہ آئیں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہے انتظار — جانبِ در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آ جائے ہے

دیوان چندو لال مدار المہام حیدرآباد نے کئی ہزار روپے بھیجکر بلا بھیجا۔ اور مصرع اپنی طرح مشاعرہ کا بھیجا۔ ذوق مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزلہ کہکر بھیجدیا۔ اور روپیہ نہ لیا۔ اُسی سے یہ چند اشعار انتخاب کرکے یہاں لکھے گئے ہیں۔

نکل گئے تھے تم جیسے بیمار ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

طفلِ اشک ایسا گرا دامانِ مژگاں چھوڑ کر
پھر نہ اٹھا کوچۂ چاکِ گریباں چھوڑ کر

کام یہ تیرا ہی تھا۔ رحمت ہے اے ابرِ کرم!
ورنہ جائے داغِ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر

میں ہوں وہ گمنام جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشیِ قدرت جگہ واں چھوڑ کر

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

گر خدا دیوے قناعت ماہِ یک ہفتہ کی طرح
دوڑے ساری کو کبھی آدھی نہ انساں چھوڑ کر

گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

۸

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

کیا ڈھونڈے دشتِ گم شدگی میں تجھے کہ ہے
عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر

اُس مرغِ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا
مرغانِ کوہ و راغ سے دور اور شکستہ پر

ساقی بطِ شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی
تجھ سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر

خود اڑ کے پہونچے نامہ جو ہو مرغِ نامہ بر
اُس شوخِ خوش دماغ سے دور اور شکستہ پر

کرتا ہے دل کا قصد کہاں وار تیرا تیر
پر ہے نشانِ داغ سے دور اور شکستہ پر

اے ذوق میرے طائرِ دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

۹

لائی حیات آئے۔ قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں؟ ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ۔ جو ہونا ہو سو ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا آہ فنا میں دیا ہے ساتھ؟
تم بھی چلے چلو یونہیں جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اِس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

انتخاب از کلیات غالبؔ

قصیدہ

ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
تجھکو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھکو کیا پایہ رُوشناسی کا — جُز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اسکے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟ — مجھکو کیا بانٹ دیگا کیا انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص — گر تجھے ہے امیدِ بخششِ عام
جوکہ بخشے گا تجھکو فرّ فروغ — کیا نہ دے گا مجھے مےِ گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی — کر چکے قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر — کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کا اِک بلوریں جام

آفتاب

صبح دم دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود — صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ۔ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پہ پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

در صفتِ انبہ

ہاں! دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟

خامے کا صفحے پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے؟ — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہے؟ — ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوئے اور یہ میدان

آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے؟ — آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اُسکی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں؟ — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟

ق جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہ کن باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اس کو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

ق نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دوا خانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام — شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

ق یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے — باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے بحکمِ ربّ النّاس — بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

ق یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل — ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل؟

ق تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد پر کہاں بو باس؟

آم کو دیکھتا اگر ایک بار — پھینک دیتا طلائے زر افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا　　نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ　　طوبےٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم　　ناز پروردۂ بہار ہے آم

قطعہ

اے تازہ واردانِ ہوائے بساطِ دل !　　زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غزلیات

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا؟　　زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا؟
بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک　　ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا؟
حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ　　کوئی مجکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں　　عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی　　یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟　　ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا؟
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد　　ہمنے مانا یہ کہ دلّی میں رہیں ۔ کھائینگے کیا؟

۲

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا | اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا | کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؟ | کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا | جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے | مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا! | نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا | جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب | تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۳

ہے بس کہ ہر اک انکے اشارے میں نشاں اور | کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات | دے اور دل انکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اٹھیں گے | لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا | ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا | ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین | کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے | رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے | کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

۴

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور | تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں" | مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف / کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور؟
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے / پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور؟
تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے؟ / کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی / بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش / کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب / قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

۵

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک / کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک؟
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ / دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب / دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک؟
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے - لیکن / خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم / میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
اک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل / گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج؟ / شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۶

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں / خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں؟
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں / لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر / لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا / بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے / میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم / ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں — دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

٧

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟ — کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے؟ — اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

٨

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی
کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ — شاہِ دیں دار نے شفا پائی

٩

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پہ نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس منھ سے جاؤگے غالب — شرم تمکو مگر نہیں آتی

۱۰

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے؟
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزۂ و عشوۂ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزۂ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟
ہمکو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تمپر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

۱۱

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے — اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ — اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید — مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

میر ببر علی انیس

پیدائش فیض آباد سنہ ۱۲۱٦ھ — وفات لکھنؤ سنہ ۱۲۹۱ھ

میر مستحسن خلیق کے بیٹے اور میر حسن دہلوی کے پوتے تھے۔ لکھنؤ میں تربیت پائی اور ضروریاتِ فن سے آگاہی حاصل کی۔ اپنے خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد تھے۔

ابتدا میں انھیں غزل کا بھی شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے۔ اور غزل پڑھی۔ وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ یہ خبر سنکر دل میں تو باغ باغ ہوا۔ مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں گئے تھے؟ انھوں نے حال بیان کیا۔ غزل سنی۔ اور فرمایا کہ "بھائی! اب اس غزل کو سلام کرو۔ اور اس شغل میں زورِ طبع صرف کرو۔ جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے" سعادتمند بیٹے نے اسی دن اُدھر سے قطع نظر کی۔ غزل مذکور کی طرح میں سلام لکھا۔ دنیا کو چھوڑ کر دین کے دائرہ میں آ گئے اور تمام عمر اسی میں صرف کر دی۔ نیک نیتی کی برکت نے اسی میں دین بھی دیا۔ اور دنیا بھی۔

ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان اردوے معلّیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی۔ حسنِ بیان لطفِ محاورہ۔ کلام کی صفائی اس درجہ ہے۔ کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ انھوں نے ایجادِ مضامین کے دریا بہا دئے ایک ایک مفرد مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے۔ صبح کا عالم دیکھو۔ تو سبحان اللہ۔ رات

کی رخصت ۔ سیاہی کا پھٹنا ۔ نور کا ظہور ۔ آفتاب کا طلوع ۔ مرغزار کی بہار ۔ شام ہے ۔ تو شامِ غریباں کی اُداسی ۔ کبھی رات کا سناٹا ۔ کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگا رنگ سے دکھانا ۔ غرض جس حالت کو لیا ہے ۔ اُس کا سماں باندھ دیا ہے ۔

سنہ ولادت کا کسی تذکرہ سے پتہ نہیں چلتا ۔ مگر یہ معلوم ہے کہ تقریباً ۴۷ برس کی عمر پائی ۔ اور ۲۹ ۔ شوال ۱۲۹۱ھ بروز جمعہ اِس جہانِ فانی سے آپ نے رحلت کی ۔

مناجات

یارب! چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر
اے ابرِ کرم! خشک زراعت پہ کرم کر!
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر!
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میری قلمرو سے نہ جائے

اِس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری
بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گذاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری
پھل ہمکو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا ہو نہ جن پھولوں کی بو کو

غواصِ طبیعت کو عطا کر وہ لآلی
ہو جن کی جگہ تاجِ سرِ عرش پہ خالی
اک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی
عالم کی نگاہوں سے گرے قطبِ شمالی
سب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر آنکھ یہ ہو نگے جنھیں رشتہ ہے نبی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اِس دُرجِ دہاں کو
دریائے معانی سے بڑھا طبعِ رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو
عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حُسنِ بیاں کو
تحسیں کا سموات سے غُل تا بہ سمک ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّہ کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں
خاروں کو نزاکت میں گُلِ تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں　　اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

گر بزم کی جانب ہو توجہ دمِ تحریر　　کھنچ جائے ابھی گلشنِ فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبتِ انجم فلکِ پیر　　ہو جائے ہوا بزمِ سلیماں کی بھی توقیر
یوں تختِ حسینانِ معانی اُتر آئے　　ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

ساقی کے کرم سے ہو وہ دَور اور چلیں جام　　جس میں عوضِ نشہ ہو کیفیتِ انجام
ہر مست فراموش کرے گردشِ ایّام　　صوفی کی زباں بھی نہ رہے فیض سے ناکام
ہاں بادہ کشو! پوچھ لو میخانہ نشیں سے　　کوثر کی یہ موج آ گئی ہے خلدِ بریں سے

آئیں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم　　خیبر کی خبر لائے مری طبعِ اولوالعزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم　　دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم
جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے　　تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

مصرع ہوں صف آرا صفتِ لشکرِ جرّار　　الفاظ کی تیزی کو نہ پہنچے کوئی تلوار
نقطے ہوں جو ڈھالیں تو الف خنجرِ خونخوار　　مد آگے بڑھیں برچھیوں کو تول کے یک بار
غُل ہو کہ کبھی یوں فوج کو لڑتے نہیں دیکھا　　مقتل میں رن ایسا کبھی پڑتے نہیں دیکھا

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکنِ ماہی　　عالم کو دکھا دے تپشِ سیفِ الٰہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی　　لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی
ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا　　تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا

مناظرِ قدرت

عربی اور فارسی میں مناظرِ قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اور اُردو میں تو گویا سرے سے اس کا وجود ہی نہ تھا۔ میر ضمیر نے سب سے پہلے اس پر طبع آزمائی کی لیکن وہ مضمون بندی اور استعارات کو کلام کا اصلی جوہر سمجھتے تھے۔ اس لئے اصلی حالت کو نہ ادا کر سکے۔ میر انیس نے اس صنف پر اگرچہ دو تین مرثیے

لکھے ہیں - لیکن جو کچھ لکھا ہے - کمال کے درجہ پر پہونچا دیا ہے -

صبح کا سماں

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقابِ شب
در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب
انجم کی فرد فرد سے لیکر حسابِ شب
دفتر کشائے صبح نے الٹی کتابِ شب
گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے عیاں
چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں
مرجھا کے رہ گئے ثمر و شاخِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخیٔ شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کے شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشتِ کربلا کی زمیں رشکِ آسماں
تھا دور دور تک شبِ مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذرّوں پہ تھا گماں
نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
سرسبز جو درخت تھا وہ نخلِ طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

ایضاً

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح

کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم
مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم

وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار
تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار

چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار
کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

وا کھلتے در تھے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں
تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤسِ آسماں

ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں
نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں

ہر نخل پر ضیا سے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد

رکھتی تھی پھونک پھونک کے قدم اپنا ہوا سے سرد
یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

گرمی کا سماں

گرمی کا سماں شعرائے فارسی نے باندھا ہے۔ لیکن نہایت مبالغہ اور دور از کار خیالات سے کام لیا ہے۔ میر انیس بھی اگرچہ رواجِ عام کے اثر سے۔ نیچرل حالت سے۔ جابجا تجاوز کر گئے ہیں۔ تاہم ان کا اصلی جوہر بھی نمایاں ہے۔

وہ لُو۔ وہ آفتاب کی حدّت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب

خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر

مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

سو سو دن کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار

گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتّے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں

منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینہ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب

سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

منظر

کسی خاص واقعہ یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنا۔ جس کو انگریزی میں سین کہتے ہیں۔ واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے۔ عام واقعہ نگاری اور سین میں

یہ فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے سین اس کیفیت کا نام ہے۔ جو متعدد واقعات یا واقعہ کے متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اس شعر میں ؎

"لوں چلتی ہے۔ خاک اڑتی ہے۔ ہے ظہر کا ہنگام
تنہا یہ چلی آتی ہے۔ آندھی سبکہ شام"

لوں کا چلنا۔ خاک کا اڑنا۔ ظہر کا وقت ہونا۔ فوجوں کا امنڈنا۔ ہر چیز کو الگ الگ لیا جائے تو واقعہ ہے۔ اور ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سین ہے۔

میر انیس نے شاعری کی اس صنف کو جس کمال تک پہونچایا۔ اردو کیا؟ فارسی میں بھی اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ہم چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں

گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت
پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت
سونلا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہرے پہ ڈالے ہیں
ٹوٹے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں
وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج و مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر
لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشک بار اٹے ہیں غبار سے

فوجوں کی آمد اور جنگ کی تیاری

ہے شورِ آمد آمدِ فوجِ فلک سریر
فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے بہیر
دعوت کے واسطے ہیں سنانیں لئے شریر
حضرت کے پیشکش کو کمانیں ہیں اور تیر
پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں
تیغیں سلاح خانہ سے نکلی ہیں بے شمار
ہے جابجا درستیِ اسبابِ کارزار

ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کئی ہزار — خنجر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار
کوتیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر — پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

گرمی کی شدت

مخفی تھے شیر شدت گرما سے جھبر میں — جلتی تھی یہ لُوں آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نے بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ بر میں — جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں
پایاب ہو گئے تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے — سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنوئیں خشک پڑے تھے

گرمی سے بچنے کی تدبیریں

پھرتا تھا وہ سرد پریشاں کوئی ہو کے — دامن سے ہوا دیتا تھا منہ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لُوں سے ردا چہرہ پہ رو کے — رکھ لیتا تھا سر پہ کوئی رومال بھگو کے
پڑتی تھیں جو چھینٹیں تو مزا دیتا تھا پانی — جھک کر کوئی چلو ہی سے پی لیتا تھا پانی

فوجوں کا داخلہ اور تیاری جنگ

خیمہ میں اُترے یاں تو شہ عرش بارگاہ — آ آ کے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ
گھوڑوں پہ علم کھلے تھے جدھر کیجئے نگاہ — یاں تک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ
فوجوں سے تا بہ صبح زمیں رن کی بھر گئی — ایک رات میں چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی
اس کثرت سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم — آ پہنچا شام سے پسر سعد نحس و شوم
جسکے جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم — اکثر ہیں یکہ تاز جوانان شام و روم
بس کھل گیا یہ طور صفائی کا ہوئیگا — اب کل سے بندوبست لڑائی کا ہوئیگا
یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں — انداز میں یہ ظلم کا دریائے بیکراں

موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثلِ بادباں
ہلتا تھا دشت تا کہیں - ڈھل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے
جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دَل
خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار رو اہل ناز و دغا باز پُر دغل
نکلیں مہیب دیو سے قد ابرؤں پہ بل
بدخواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے کھلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے
تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار
غل ہوگیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دھمدھم تھی صدا آسماں کے پار
آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں کے گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

رزمیہ

رزمیہ شاعری اگرچہ واقعہ نگاری ہی کی ایک قسم ہے - لیکن وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے اس کے لئے جدا عنوان قائم کیا گیا - اردو بلکہ عربی میں بھی رزمیہ شاعری کو چنداں ترقی نہیں ہوئی - اُردو میں میر تقی ہوس کے چند اشعار ہیں - جو نوفل اور لیلیٰ کے قبیلہ کی لڑائی کے موقع پہ لکھے ہیں - مرثیہ میں میر ضمیر نے رزمیہ کی ابتدا کی - لیکن وہ بالکل نقش اوّلین تھا - میر انیس نے جس طرح اِس صنعت کو کمال کے درجہ تک پہونچایا - اِس کے لحاظ سے اُردو شاعری گو فارسی کے برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتی - لیکن عربی سے کسی طرح پیچھے نہیں رزمیہ شاعری کا کمال اُمورِ ذیل پہ موقوف ہے - سب سے پہلے لڑائی کی تیاری معرکہ کا زور شور - تلاطم - ہنگامہ خیزی - ہل چل - شور و غل - نقاروں کی گونج ٹاپوں کی آواز - ہتھیاروں کی جھنکار - تلواروں کی چمک دمک - تیروں کی بچھا کمانوں کا سڑکنا - نقیبوں کا گرجنا - اِن چیزوں کا اِس طرح بیان کیا جائے کہ آنکھوں کے سامنے معرکۂ جنگ کا سماں چھا جائے پھر بہادروں کا میدان جنگ میں جانا - مبارز طلب ہونا - باہم معرکہ آرائی کرنا - لڑائی کے داؤں کے

پیچ دکھانا۔ ان سب کا بیان کیا جائے۔ اس کے ساتھ اسلحۂ جنگ اور دیگر سامانِ جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچی جائے۔ پھر فتح یا شکست کا بیان کیا جا[ئے] اور اس طرح کیا جائے۔ کہ دل دہل جائیں۔ یا طبیعتوں پر اداسی یا غم کا عالم چھا جائے۔ میر انیس میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔

ہنگامۂ جنگ

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بیک
اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک
قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادیِ نبرد
گردوں پہ مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخِ چارمیں پہ رخِ آفتاب زرد
ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجومِ فوج سے وہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنّات کانپ کے کہتے تھے "الحذر"
"دنیا میں خاک اڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر"
اندھیر ہے اٹھی برکت اب جہان سے
ڈول گیا زمیں کا طبق آسمان سے

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ۔ کانپتا تھا وادیِ نبرد
تھا دن بھی زرد۔ دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد
خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا میں گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشمِ مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیطِ سپہر میں

فوج کی تیاری اور سامان

امڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل
تھے برچھیوں کے صورتِ مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جن کی آب میں تھی تلخئ اجل
وہ گرز جن کے ڈر سے گرے دیو منہ کے بل
ڈو ڈو تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے کچھے ہوئے حلقے کمند کے

وہ دھوم طبلِ جنگ کی وہ بوق کا خروش
کر ہو گئے تھے شور سے کرّوبیوں کے گوش
تھرائی یوں زمیں کہ اڑے آسماں کے ہوش
نیزے ہلا کے نکلے سوارانِ درع پوش
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سوارانِ شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

حد سے فزوں ہے کثرتِ افواجِ نابکار
نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ ہے تیغ آبدار
ہر سمت ہے سناں پہ سناں مثلِ کارزار
ہر صف میں ہے سپر پہ سپر مثلِ لالہ زار
پیکاں بہم ہیں جیسے ہوں گل بے کھلے ہوئے
گوشوں سے ہیں کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں چمکتی ہیں
نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں
نیزے تلے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں
سنگیں دلوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرزِ گراں سر اٹھائے ہیں

دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنونِ جنگ

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزہ کو دی تکاں
چمکی انی تو برق پکاری کہ "الاماں"
اک بند باندھ کہ جو فرس سے کہا کہ "ہاں"
ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زد ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوبِ نیزہ کو لایا وہ فرق پر
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر

نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا
سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب
قبضہ میں لی کمانِ کیانی بصد غضب
چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب
تیور چڑھائے قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیرِ نگاہ سے وہ خطاکار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اتر گیا

گھوڑے کی تعریف

لکھتا ہے ادہمِ قلم اب سرعتِ عقاب
نعل اس کی ماہِ نو ہیں تو سُم رشکِ آفتاب
پستی میں سیل ہے تو بلندی میں ہے سحاب
سرعت میں برق - گرم روانی میں جیسے آب
اڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے
اک شور تھا قدم نہیں دریا کی موج ہے

نازک مزاج - نسترن اندام - تیز رو
گردوں سپہر - بادیہ پیما - قُو - برق دو
اس کا ہر اک قدم نہ زغندیں ہرن کی سنو
دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اسے نہ جو
رفتار میں ہوا تھا - اشارے میں برق تھا
سرعت میں کچھ کمی تھی نہ چھل بل میں فرق تھا

صرصر سے تند - بو سے سبک رو - ہوا سے تیز
چالاک فہم و فکر سے - ذہن رسا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر و عقاب و ہما سے تیز
جاتے ہیں اڑ کے ہدہد شہرِ صبا سے تیز
ذی جاہ تھا - سعید تھا - فیروز بخت تھا
رہوار کیا ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا

سمٹا - جما - اڑا - ادھر آیا - اُدھر گیا
چمکا - پھرا - چھال دکھایا - ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سُم وہی کا وار تھا

پھرتا تھا کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے
سرعت بلائیں لیتی تھی منہ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے
غل تھا یہ غول ہیں پسرِ سعدِ شوم کے
"رخش ایسا روم و رے میں نہیں شام میں نہیں
یہ شوخیاں تو ابلقِ ایام میں نہیں"

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند — سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند — نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سر بلند
گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اُڑ گیا — پُتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مُڑ گیا

آہو کی جست - شیر کی آمد - پری کی چال — کبکِ دری خجل - دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال — اِک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا — چھل بل غضب کے تھے کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا - کبھی رہوار بن گیا — آیا عرق - تو ابرِ گہر بار بن گیا
گہ قطب - گاہ گنبدِ دوّار بن گیا — نقطہ کبھی بنا - کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اسکی گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے — تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

تلوار کی تعریف

چمکی - گری - اُٹھی - اِدھر آئی - اُدھر گئی — خالی گئے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم - کبھی بالائے سر گئی — ندّی غضب کی تھی - کہ چڑھی اور اُتر گئی
غُل رن میں تھا "یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں — ایسا تو رُودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں"

بجلی گری - کہ فوج پہ تیغِ دو سر گری — کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری — سر کاٹ کر اِدھر سے جو اُٹھی - اُدھر گری
زرہیں تنوں میں مثلِ کفن چاک ہو گئیں — اِک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہو گئیں

اِک شور تھا کہ "تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر؟ — بہتی ہے جسکی آگ سے کوسوں لہو کی نہر"
ناگن ہے یہ کہ کاٹے کی جسکے نہیں ہے لہر — اُتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن میں زہر"
زخموں سے جسم - ڈر سے کلیجے فگار ہیں — جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندانِ مار ہیں"

یکتا برش میں - جوہرِ ذاتی میں قدر میں — چمکی اُحد میں - خیبر و خندق میں - بدر میں

تیزی وہی تھی سناں کی۔ اس آشوب و غلاف میں
بڑھ کر سپر سے سر میں گئی۔ سر سے صدر میں
کھنچے ہوئے سپر سے نیا رنگ ڈھنگ تھا
راکب تھا۔ نہ فرس تھا۔ نہ زیں تھا۔ نہ تنگ تھا

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری
برچھی سے اڑ گئے وہ سناں یہ گرہ گری
ترکش کٹا۔ کمانِ کیانی۔ زرہ گری
یہ سر اڑا۔ وہ خود اڑا۔ یہ زرہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برقِ قہرِ الٰہی اسی طرح

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف
ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف
پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف
پرکالے اڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف
خاطر نشاں نہ تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھیں کٹی ہوئی شاخیں کمان کی

کیا کیا چمک دکھائی تھی سر کاٹ کاٹ کے!
تلتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانئے ملا تھا مزا کیا زبان کو؟
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو۔

ہر ہاتھ میں اڑا کے کلائی۔ نکل گئی
کوندی۔ گری۔ زمیں میں سمائی۔ نکل گئی
کاٹی زرہ۔ دکھا کے صفائی۔ نکل گئی
مچھلی تھی اک۔ کہ دام میں آئی۔ نکل گئی
چار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
پہنچوں سے ہاتھ۔ شانوں سے بازو۔ تنوں سے سر
قبضہ سے تیغ۔ بر سے زرہ۔ ہاتھ سے سپر
برچھی سے پھل۔ کماں سے زہ۔ زیں سے بشر
ترکش کہیں پڑے تھے نشانِ زری کہیں
پیکاں کہیں تھی شست کہیں تھی مری کہیں

جب صف پہ وار کرتے تھے سلطانِ بحر و بر
اڑتی تھی کٹ کے صورتِ کاغذ ہر اک سپر
چھپتی تھیں۔ بھاگی جاتی تھیں۔ گرتے تھے خاک پر
قبضوں سے تیغیں۔ جسم سے روحیں۔ تنوں سے سر
پے تھے قدم۔ گریز کے کوچے بھی بند تھے
شعلہ وہ تیغ تھی۔ سرِ اعدا سپند تھے
چلتے تھے وہ یوں دیکھ کے اس تیغ کی چمک
بھاگے شعاعِ مہر سے جس طرح شپرک

اوج سما سے زلزلہ برپا تھا تا سمک ۔۔۔ چمکی وہ جب تو کانپ گئے چرخ پر ملک
ہر شئے تھی خوف جاں سے خضوع و خشوع میں ۔۔۔ سجدہ میں تھی زمیں ۔ تو فلک تھا رکوع میں
چم خم وہ تیغ کا تھا ۔ وہ کاٹ ۔ اور وہ آب و تاب ۔۔۔ آتش کسی جگہ ۔ کہیں بجلی ۔ کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر ۔ کہ اسکی تاب ۔۔۔ تیزی زباں میں وہ ۔ کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اُس کا جسم جواہر نگار تھا ۔۔۔ گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا
پیاسی کبھی خون فوج کی اور آبدار بھی ۔۔۔ غل تھا ۔ کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ۔ ابر تر بھی ۔ خزاں بھی ۔ بہار بھی ۔۔۔ تلوار بھی ۔ چھری بھی ۔ سپر بھی ۔ کٹار بھی
پانی لے اسکے آگ لگا دی زمانے میں ۔۔۔ اک آفت جہاں تھی لگانے بجھانے میں
تیروں کے بند بند قلم ۔ برچھیاں دو نیم ۔۔۔ مثل قلم زبان و رار سناں دو نیم
چار آئینہ کٹے ہوئے ۔ گرز گراں دو نیم ۔۔۔ مغفر سے تا کمر جسد پہلواں دو نیم
سالم تھا پیش آئینہ تیغ جو نہ تھا ۔۔۔ لشکر میں کوئی نہ تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا
وہ تیغ جب بڑھی صف کفار ہٹ گئی ۔۔۔ چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو اُلٹ کر پلٹ گئی ۔۔۔ رن کی زمیں لہو کے ڈریڑوں سے کٹ گئی
دریا بھی آب تیغ سے بے آبرو ہوا ۔۔۔ غل تھا کہ "لو فرات کا پانی لہو ہوا"

نفرت دنیا و محبت عقبیٰ

اِس منزل فانی میں دل اپنا نہ لگاؤ ۔۔۔ اُلفت نہ کرو اس سے چلے چھوڑ کے جاؤ
یہ عاریتی جا ہے ۔ یہاں گھر نہ بناؤ ۔۔۔ پابندی دنیا سے بس اب ہاتھ اُٹھاؤ
چلتے ہوئے ۔ ہرگز کوئی کام آ نہ سکے گا ۔۔۔ ہمراہ کچھ اسباب جہاں جا نہ سکے گا
یاں رخت اقامت کا سرانجام ہے بیجا ۔۔۔ اس منزل پُر خوف میں آرام ہے بیجا
عقبیٰ کے سوا یاں کا ہر اک کام ہے بیجا ۔۔۔ مانند نگیں آرزوے نام ہے بیجا

سینے میں یہ دم مثلِ چراغِ سحری ہے
کر تو عمل خیر یہی ناموری ہے
امید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام
ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشید لبِ بام
یاں کام کرو ایسا کہ آئے جو وہاں کام
آپہونچے خدا جانے کب موت کا پیغام
اپنی نہ کوئی ملک نہ املاک سمجھنا
ہونا ہے تمہیں خاک یہ سب خاک سمجھنا

دنیا میں سدا ایک سا رہتا نہیں احوال
ادبار ہے انسان کا کبھی اور کبھی اقبال
اندوختہ کرتے جسے لگتا ہے سہ و سال
آجاتا ہے وہ غیر کے قبضہ میں زر و مال
خالی رہیں گے بعدِ فنا ہاتھ تمہارے
کچھ جمع ہوا ایسی کہ چلے ساتھ تمہارے

بھائی نہ تو کام آئیگا اُس وقت نہ فرزند
عرصہ نہیں کھل جائیگا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہووے رضا مند
ہشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند
پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہہ شاہ و گدا کنجِ لحد ہے

ہیں زیرِ زمیں صاحبِ تخت و علم و تاج
جو صاحبِ نوبت تھے نشاں اُنکے نہیں آج
جو شاہ کہ شاہوں سے سدا لیتے رہے باج
وہ بعدِ فنا آپ کفن کے رہے محتاج
درویش و غنی سب کے ہمیشہ رہے شاکی
بتلاؤ کہ دُنیا نے کسی سے بھی وفا کی؟

کیا سخت گھڑی ہوگی اجل آئیگی جس دم!
کھنچ کھنچ کے ہر اک رگ سے نکلنے لگے گا دم
کیا دیکھیں گے ایک ایک کو حسرت سے بصد غم!
اتنی بھی زباں ہل نہ سکے گی کہ "سب چلے ہم"
سب کے لیئے اک روز یہ تکلیف دھری ہے
اس پر بھی یہ غفلت ہے عجب بیخبری ہے

بھائی نہیں اپنے ہیں - نہیں ہے پسر اپنا
بیگانے ہیں سب ہوئیگا جس دم سفر اپنا
نہ مال نہ اسباب نہ زیور نہ زر اپنا
دو گز ہے کفن - قبر کا گوشہ ہے گھر اپنا
کچھ ساتھ بجز بیکسی و یاس نہ ہوگا
رہ جائیں گے سب دور کوئی پاس نہ ہوگا

اس زیست پہ بھولو نہ - اجل کو بھی کرو یاد
گھر سیکڑوں یاں سیلِ فنا سے گئے برباد
دنیا میں عمارت نہ بنا کر ہو کوئی شاد
اس قالبِ خاکی کی عجب سست ہے بنیاد

کل اوج پہ جو لوگ تھے وہ زیرِ زمیں ہیں — ہے خاک کا ڈھیر اب نہ مکاں ہیں نہ مکیں ہیں
کس کس گُلِ رنگیں کی نہ اس باغ میں تھی دھوم — اک آن میں شبنم کی طرح ہو گئے معدوم
دکھلا رہی ہے رنگ عجب ہستیٔ موہوم — کیا قصد ہے گلچینِ اجل کا نہیں معلوم
اس باغ میں جس سرو کو دیکھا تو رواں ہے — جس گل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے
دنیا یہ سدا عبرت و اندیشہ کی جا ہے — یاں کیسا مقام آٹھ پہر کوچ لگا ہے
جاتے ہیں چلے مرگ کا دروازہ کھلا ہے — رہ جائے نہ کوئی یہی آوازِ درا ہے
ہے راہ کڑی زادِ سفر پاس نہیں ہے — منزل پہ پہونچنے کی ہمیں آس نہیں ہے

مرزا سلامت علی دبیر

خاندانی شاعر نہ تھے۔ لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہونچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے۔ اور جو کچھ استاد سے پایا۔ اسے بہت بلند اور روشن کرکے دکھایا۔ طبیعت ایسی گداز پائی تھی۔ جو اس فن کے لیے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ ان کی سلامت روی پرہیزگاری۔ مسافر نوازی۔ سخاوت نے صفتِ کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔ شوکتِ الفاظ۔ مضامین کی آمد۔ جا بجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنائے۔ الم ناک اور دلگداز انداز۔ جو مرثیہ کی غرض اصلی ہے۔ ان وصفوں کے بادشاہ ہیں۔ ۲۹ محرم سنہ ۱۲۹۲ ہجری کو ۷۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس مدت میں کم سے کم ۳ ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ اب ویسا زمانہ آئے گا۔ نہ ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوں گے۔

صبح کا سماں

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی

اور قطعِ زلفِ لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی | مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخ ہنر مند کے لئے | دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

یوسف غریقِ چاہ سیہ ناگہاں ہوا | یعنی غروب ماہِ تجلّی نشاں ہوا
یونس وہاں ماہیِ شب سے عیاں ہوا | یعنی طلوعِ نیّرِ مشرق ستاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب | دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا فلک کا وہ جیبِ دریدہ تھا؟ | یا چہرۂ مسیح کا رنگِ پریدہ تھا؟
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا؟ | یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا؟
کہئے نہ مہر صبح کے سینہ پہ داغ تھا | امیدِ اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

روزِ سفید یوسفِ آفاق شب نقاب | مغرب کے چاہ میں تھا جو وہ زیرِ آفتاب
سقّائے آسماں نے لیا ڈولِ آفتاب | اور ریسماں شعاع کی باندھی بآب و تاب
یوسف کو ڈولِ مہر میں بٹھلا کے چاہ سے | کھینچا نواحِ شرق میں مغرب کی راہ سے

نکلا افق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح | محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح
کھولا سفیدی نے جو مصلّائے پیرِ صبح | پر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیرِ صبح
کرتی تھی شب غروب کا سجدہ و دور کو | سیّارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا | پھر مشکِ شب جہاں سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دور ہو گیا | باطل رسالۂ شبِ دیجور ہو گیا
کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں | مضمون تھا آفتاب کا ذرّوں کے نامے میں

جوزا عنانوں کے ہوا جولاں جو راہوار | سیّارے بھولے سیر و تماشائے روزگار
تارے ہوئے جو صرفِ چراگاہ ایک بار | باقی نہ کہکشاں کی رہی گاہ زینہار
برباد سبزۂ روشِ کہکشاں ہوا
پامال برجِ سنبلۂ آسماں ہوا

شمشیر آبدار

اللہ رے آمد آمد شمشیر دو زباں!
ششدر تھے چار لاکھ کہ "کیا شے ہے الاماں"
جنبش نہ ہاتھ کو تھی نہ تیغوں کے درمیاں
مشعلوں کے ہوں پنجہ میں جیسے چھ انگلیاں
ضرب اک طرف کہ سایہ سے اس کے مفر نہ تھا
قبروں میں ایک فرد کی گردن پہ سر نہ تھا

اس سے الجھ گئی کبھی اس سے الجھ گئی
بینش نئی - صفائی نئی - کج رُخی نئی
اک سر سے لگ کے چلی - تو الگ سر ہو گئے کئی
گہہ زرد - گہہ سفید - ہوا چرخ سرمئی
بھاگے ہوؤں کو ضرب پہ لاتی تھی گھیر کر
ڈر کرتی تھی اُڑی ہوئی رنگت کو پھیر کر

گہہ ہمدمِ صور سرافیل کرتی تھی
گاہے عیادتِ پرِ جبریل کرتی تھی
گہہ برجِ مہر ماہ میں تحویل کرتی تھی
برش زیادہ چھپنے میں تعجیل کرتی تھی
محو نظارہ مردمِ نظارہ ہو گئے
قطبِ سپہر اخترِ سیارہ ہو گئے

ہر سُو تھا شور تیغ کا کچھ اور ڈھنگ ہے
قالب میں نیری ہے مگر یہ نہنگ ہے
داخلِ میانِ خانۂ دل بے درنگ ہے
رن کی قسم یہ تیغ بڑی خانہ جنگ ہے
حق تو یہ ہے کہ مسئلہ دانِ تیغِ شاہ ہے
سر چڑھ کے سب سے لڑتی ہے اور بے گناہ ہے

کہتی تھی بار بار "قضا کیا ہے؟ ہاں میں ہوں، میں
طوفان و حشر و قہر و بلا کیا ہے؟ ہاں میں ہوں میں
دوزخ - سقر - عذابِ خدا کیا ہے؟ ہاں میں ہوں میں
راہِ عدم - دیارِ فنا کیا ہے؟ ہاں میں ہوں میں
حق سے ڈرو تو مژدۂ فضلِ الٰہ ہے
توبہ کرو تو قبضہ میں میرے پناہ ہے"

ہاں سب کو تھا یقیں کہ وہاں تھی وہیں نہ تھی
واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
ہر جا تھی - اور جو پوچھو کہاں تھی؟ کہیں نہ تھی
لاکھوں کے قتل کرنے کو ہاں تھی نہیں نہ تھی
اس برقِ ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے؟
واں تھے جہاں زمیں نہ تھی - آسماں نہ تھے

قالب کی یہ تو دشمنِ جاں تھی و دمِ نگاہ
قطعِ نظر بدن سے نگہ کو نہ تھی پناہ

دعوے کے صدق کے لیے حجت تھی اور گواہ — سن لو دلیل قطعی اگر ہو کچھ اشتباہ
آیا نظر نہ ریشۂ موئے سیاہ کو — تیغ علی نے قطع کیا تھا نگاہ کو

رل کر چلی فلک سے ۔ تو بجلی جدا ہوئی — تڑپی یہ زیر خاک ۔ تو مچھلی ہوا ہوئی
چمکی جو خود سر پہ قیامت بپا ہوئی — روشن ہوئی جو سینہ پہ ۔ جوشن قبا ہوئی
کھولے زرہ کے ایک نظر میں ہزار بند — کاٹے ہزار طرح عناصر کے چار بند

بے نام و بے نشاں تھا ہر اک پہلواں کا اسم — تقسیم ضرب سے رہی باقی نہ کوئی قسم
سائے کی شکل ڈھال چرائی تھی اپنا جسم — یہ تیغ کے ہنر تھے کہ جادو تھا یا طلسم
دل رشتہ رشتہ کر کے زرہ کو اڑا دیا — طائر کو جال ۔ جال کو طائر بنا دیا

موج زرہ کا تیغ کی گرمی سے تھا یہ حال — شبنم کا جیسے صبح کو خورشید سے زوال
جب یہ کڑی ہوئی تو زرہ ہو گئی نڈھال — ڈھالا یہ کیا عرق شرم کی مثال
جی پہ بنی زرہ کی جو صورت بگڑ گئی — کیا دن دہاڑے یاغیوں پہ اوس پڑ گئی

گھوڑے کی تعریف

طاؤس فلک سپہر دوم جلوہ گری تھا — بو گل میں تو گلشن میں نسیم سحری تھا
چہچہے سے عیاں قہقہۂ کبک دری تھا — آہو تھا چرندوں میں پرندوں میں پری تھا
کاوہ کی ثنا کیجئے دل اس پہ تلا ہے — دریا سے کوئی عقدۂ گرداب کھلا ہے
غل تھا کہ "چکور آگ کو کھا کر نکل آیا — مرکب کا جگر چیر کے راکب نکل آیا"
بے روح ہوا دل جو وہ پیکر اچھل آیا — سینہ کا لہو پہ کے جو گردن میں ڈھل آیا

بے جان جگر و قلب بہم رہ گئے باقی
طاؤس اڑا نقش قدم رہ گئے باقی

منشی امیر اللہ تسلیم

پیدائش فیض آباد سنہ ۱۸۲۰ء وفات لکھنؤ سنہ ۱۹۱۱ء

مولوی عبدالصمد صاحب کے بیٹے۔ اور مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اور عربی کی کتابیں اپنے بھائی مولوی عبداللطیف صاحب سے پڑھیں۔ فن خوشنویسی منشی عبدالحئی صاحب سندیلوی سے حاصل کیا۔ مدت تک آپ کا قیام لکھنؤ میں رہا۔ پھر منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے توسل سے رام پور تشریف لے گئے۔ وہاں تیس روپے ماہوار اور دو سو روپے عید کے موقع پر آپ کو ملا کرتے تھے۔ بعد چندے وہیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس وغیرہ کے مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ اس وقت تنخواہ پچاس روپیہ تک ہوگئی۔ جب نواب صاحب والی رام پور سفر انگلستان سے واپس تشریف لائے۔ تو آپ کا سفرنامہ۔ نظم کرکے پیش کیا۔ اس صلہ میں چالیس روپیہ ماہوار بطور پنشن آپ کے لئے مقرر ہوگئے۔ آخر عمر تک پاتے رہے۔

آپ کے کلام میں فصاحت۔ بلاغت۔ متانت۔ شوخی کمال درجہ کی ہے۔ قوت متخیلہ بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ دقیق مضامین اس سادگی اور صفائی سے ادا فرماتے ہیں۔ کہ اس کی تعریف نہیں ہوسکتی کلام کا رنگ دہلی کے شعرا کا سا ہے۔ آپ کو اسی طرز پر ناز تھا۔ خود فرماتے ہیں۔

"میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی مجھکو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض"

مثنوی میں آپ نے اغلبیت کے رنگ کی تقلید کی ہے متعدد مثنویاں لکھیں۔ جو لکھنؤ والوں سے بالکل الگ۔ نالۂ تسلیم۔ شام غریباں۔ صبح خنداں۔ دل و جان نغمۂ مسلسل۔ شوکت شاہجہانی وغیرہ مثنویاں اور نظم ارجمند۔ نظم دل افروز۔

دفترِ خیال - یہ دواوین یادگار ہیں۔

۲۸؍مئی ۱۹۱۱ء کو پانچ بجے شام کو ۹۲ برس کی عمر میں لکھنؤ میں آپ نے اس دارفانی سے رحلت فرمائی۔

حمد از نالۂ تسلیم

شگافِ کلکِ رنگیں خندہ زن ہے — مبارک باد آغازِ سخن ہے
اُترتے ہیں مضامیں آسماں سے — عیاں ہے شوکتِ رفعت بیاں سے
بھری ہے بے نیازی مدّعا میں — سرِ تمکیں ہے عرضِ التجا میں
بڑھی ہے نا تمامی گفتگو سے — مرا مطلب سوا ہے آرزو سے
خیالِ آئینہ حیرت فزا ہے — زباں مصروفِ حمدِ کبریا ہے
بنایا جس نے مقتل بوستاں کو — کفِ جلّاد برگِ ارغواں کو
لکھا ہے صفحۂ اوراقِ گل پر — شہادت نامۂ بلبل سراسر
عطا کی داغِ لالہ کو سیاہی — سراپا صورتِ مہرِ گواہی
ہنسی لب پر۔ جگر میں زخم کاری — دیا غنچے کو پاسِ پردہ داری
پئے مے نوشیِ دورِ نہفتہ — دیا پیمانۂ زخمِ شگفتہ
شہیدوں کو طلسمِ نو دکھایا — ہنسا کر زخمِ تن کو خوں رُلایا
رگِ بسمل کیا تارِ نظر کو — سکھائی رقصِ بینائی جگر کو
دلِ عاشق کو بخشا خاک ہونا — گریباں کو سکھایا چاک ہونا
گہر ریزی کہیں کی چشمِ تر سے — بھرے دامن کہیں لختِ جگر سے
حیا غنچوں کو دی رازِ نہاں کی — عنادل کو ہوس بخشی فغاں کی
کہیں ہے جلوہ گر حسنِ حسیں میں — کہیں ہے خاطرِ اندوہگیں میں

نہاں و آشکارا جلوہ گر ہے — کہیں نکہت کہیں گلبرگ تر ہے
غرض ہر رنگ میں نیرنگِ امکاں — رہا حیرت فروشِ چشمِ انساں
شہِ لولاک نے رو رو کے اکثر — کہا "ارشادِ لا احصیٰ" یہاں پر
بھلا ہم کیا، حقیقت کیا ہماری؟ — لکھیں حمد و ثنائے ذاتِ باری
مناسب ہے خموشی آشنا ہوں — شریکِ اختصارِ مدعا ہوں
زیادہ وہم سے حمدِ صمد ہے — خرد مجروحِ تیغِ دستِ رد ہے
دعا مانگیں کریں قصد اور کچھ ہم — کہیں احباب "آمیں" مل کے باہم
تمنا کا ہے خالی دستِ رنگیں — پنھا دیں خاتمِ ختمِ مضامیں

نالۂ چند دعائے عاشقانہ

الٰہی! دے زبانِ نکتہ دانی! — دکھا دوں جلوۂ حسنِ معانی
اجازت خواہ لطفِ گفتگو ہے — خموشی بہرِ رخصت روبرو ہے
نظر نوشِ سخن سے پارسا ہے — ابھی نادیدہ حسنِ مدعا ہے
حریفِ نالۂ بیداد ہوں میں — شریکِ صحبتِ فریاد ہوں میں
دلِ مشتاق پابندِ الم ہے — نفس تارِ کمندِ صیدِ غم ہے
سحاب آسا عطا کر چشمِ گریاں — مصیبت زادۂ آغوشِ طوفاں
برنگِ ابرِ تر رویا کروں میں — سدا داغِ جگر دھویا کروں میں
تپش دے نالۂ جانِ حزیں میں — اثر دے دودِ آہِ آتشیں میں
رہے بیداریوں کا حفظِ آداب — نہوں آنکھیں کبھی منت کشِ خواب
نہ کم ہو التفاتِ بیقراری — رہے تازہ خراشِ دل فگاری
خرابی دوست رکھ ہر دم مزاجی — برنگِ برق دے شعلہ مزاجی

نہ کم ہو کوئی دم سامانِ سودا
رہے سر منزلِ احسانِ سودا

برائے چاک دے دامن اگر دے
نہ بہرِ التجائے سیم و زر دے

رہے دستِ جنوں ہر لحظہ چالاک
کبھی سینہ کبھی دامن رہے چاک

ترقی پر رہے شوقِ اسیری
رہے وحشت کو پاسِ دستگیری

فلک کو لذتِ ذوقِ جفا سے
نہ دوں فرصت تقاضائے بلا سے

جبیں سا خدمتِ پیرِ مغاں ہیں
رہوں جب تک رہوں دیرِ جہاں میں

ٹھہر۔ اے شوقِ عرضِ عاشقانہ
کہاں تک وقفِ لب غم کا فسانہ؟

سنا۔ دو چار شعر ایسے خدارا
کہ جس سے مغفرت کا ہو سہارا

جنابِ کبریا میں رو کے دن رات
پڑھا کر صدقِ دل سے یہ مناجات

خدایا مثلِ کبابِ سینہ افگار
سیہ رو ہوں سیہ دل ہوں سیہ کار

بسر ہوتی ہے بیجا زندگانی
بلائے جاں ہے آشوبِ جوانی

کوئی شغل زبوں ایسا نہیں ہے
عمل میں اپنے جو آتا نہیں ہے

گذرتی ہے عجب غفلت میں اوقات
دریغا۔ حسرتا۔ ہیہات ہیہات

لحاظِ بندگی جاتا رہا ہے
سرِ نخوت نے دل میں گھر کیا ہے

گمان و وہم و جانِ درد آمیز
یہ سب ہیں شانِ شیطانی سے لبریز

اگر چاہے یہ نفسِ کفر شیوا
مرے سائے سے ہو۔ ابلیس پیدا

پشیماں۔ خستہ۔ آوارہ جگر خوں
تری درگاہ میں حاضر ہوا ہوں

نگاہِ رحم سے فرما اشارہ
دلِ مضطر کو ہو کچھ تو سہارا

لبِ مایوس ہوں خنداں طرب سے
نہ گریاں دیدۂ پرخوں ہوں اب سے

تمناؤں کو دل میں شاد پاؤں
جگر کو جان کو آباد پاؤں

سوا تیرے مرا کوئی نہیں ہے
غلط بھی آسرا کوئی نہیں ہے

کرے رحمت تری گر پردہ داری
مری بگڑی ہوئی بن جائے ساری

بہت کچھ آرزو رکھتا ہوں دل میں
ہزاروں گفتگو رکھتا ہوں دل میں

جو سن لے ایک بھی تو رحم کھا کے
نکل جائیں سب ارماں منڈھا کے

غم ہستی و مرگ و قبر و محشر
یہ سب ہوں سینۂ مضطر سے باہر

خلیل آسا جہنم باغ ہو جائے
گل فردوس دل کا داغ ہو جائے

ضعیفی میں شباب آرزو ہو
بہار ہشت جنت رنگ رو ہو

بڑھے ارماں سخی کی جیسی ہمت
گھٹے غم جس طرح ممسک کی نیت

سراپا عید بن جاؤں خوشی سے
کہوں ہر دم مبارکباد جی سے

مبادا تو اگر نا مہرباں ہو
ہر اک ذرہ بلائے جسم و جاں ہو

نوید عید ہوں اہل ستم کو
سدا ترسوں پناہ نیم دم کو

زبان و دست و پا سب دیں گواہی
اٹھاؤں تا ابد ناز تباہی

جہنم ہو۔ عذاب آتشیں ہو
گرفتار بلا جان حزیں ہو

سنے کوئی نہ فریاد جگر کو
نظر آئے نہ جز شعلہ نظر کو

عزیز و خویش و احباب و یگانہ
کریں تیر ملامت کا نشانہ

نہ سمجھیں اضطراب بیکسی کو
دکھائیں درد میں یہ اور جی کو

میں حیرت سے اس بلائے ناگہاں میں
مرا ہو کون حامی دو جہاں میں؟

کہوں اس وقت کس سے اپنے جی کی؟
کسے پروا ہو میری بیکسی کی؟

سوا اس کے کہ تو ہی مہرباں ہو
ترے کہنے سے گنگے میں زباں ہو

پکاروں اے خداوند یگانہ
کرم کر اے خطا بخش زمانہ

تری رحمت پہ ہے ناز آرزو کو
وفا کر وعدۂ لا تقنطوا کو

سنا ارباب محشر نے بصد ناز
مبارکباد آزادی کی آواز

بس اے تسلیم ترکِ التجا کر — خموشی کو بیانِ مدعا کر
بہت کچھ کر چکا فریاد و ماتم — کہاں تک حسرتِ افسانۂ غم؟

حمد باری تعالےٰ از شامِ غریباں

اجازت او خیالِ قاصدِ دل! — کہ آ پہونچا دمِ تکلیفِ مشکل
طبیعت پھر ہری کچھ ناز پر ہے — کوئی مطلب مگر آغاز پر ہے
مضامیں لپٹے ہیں فکرِ رسا سے — زباں جنبش میں ہے حمدِ خدا سے
بنایا جس نے کُن سے دو جہاں کو — کیا پیدا زمین و آسماں کو
مہ و خورشید و سایہ کو فلک وار — سکھایا ہے قدم انداز رفتار
طلسمی کارخانہ اِک بنا کے — نظر سے چھپ رہا صورت دکھا کے
بلند و پست سب اُس نے بنایا — عدم سے عالمِ ہستی میں لایا
جہاں میں اہلِ بینش کے عجب کو — وصال و ہجر بخشا روز و شب کو
کیا پیدا نشاں ہر بے نشاں کا — دکھایا رنگ نیرنگِ جہاں کا
دیا ساماں شاہانہ کسی کو — بنایا خاکِ ویرانہ کسی کو
کسی کو عشق کی لذت عطا کی — مزا دیتی رہی اندوہ و عنا کی
دکھائے جلوہ ہائے حسنِ خوباں — بنایا صورتِ آئینہ حیراں
چھپائے سیکڑوں جلوے دکھا کے — بنائیں صورتیں کیا کیا بنا کے!
نہ غافل تھے نہ ہے فرزانہ باقی — فقط عالم میں ہے افسانہ باقی
تماشا دوست یارِ خود نما ہے — تصور بن کے پھرتا جا بجا ہے
کہیں شوکت ہے شانِ انبیا کی — کہیں عظمت ہے ذکرِ اولیا کی
کہیں ہے ہیبتِ اخوانِ یوسف — کہیں ہے عصمتِ دامانِ یوسف

شرارِ شعلہ افزا ہے کہیں وہ
ادیبِ ہوش موسیٰ ہے کہیں وہ

کہیں ہے التماسِ شوقِ دیدار
کہیں ہے محرمِ اسرارِ افکار

کہیں طالب کہیں مطلوب ہے وہ
غرض ہر رنگ میں کچھ خوب ہے وہ

سنبھل اے سرخوشِ پیمانۂ شوق
خرابِ بادۂ خمخانۂ شوق

زیادہ تر نہ دے زحمت قلم کو
مئے وحدت کے بدلے کھینچ دم کو

کہاں تک ایک سی آہنگِ فریاد؟
بدل اب اور کوئی رنگِ فریاد

ملک مشتاق ہیں حرفِ دعا کے
فلک پر بھیج تحفے التجا کے

انتخاب از کُلیّاتِ حالی

مناظرۂ واعظ و شاعر

کل جو میں نے بسترِ راحت پہ جا کر دم لیا
دل کو اک وقفہ غمِ دنیا سے فرصت کا ملا

کی تصور نے وہیں اک بزمِ رنگیں آشکارا
مجلسِ اربابِ معنی جس کو کہنا ہے بجا

گرم تھا واں ہر طرف ہنگامۂ بحث و نظر
سرخرو گلگونۂ حجت سے تھا ہر مدعا

شمعِ استدلال میں روشن تھا فانوسِ بیاں
چار سو ہنگامہ آرا تھی لِم و لا کی صدا

تھے فراہم جس قدر اس بزم میں اہلِ کمال
تھا شرف کا اپنے اپنے فن کے سب کو ادعا

مولوی کہتے تھے "غیر از علمِ دیں سب ہیچ ہے"
فلسفی کہتے تھے "ہر فن کی ہے حکمت پر بنا"

صوفیِ صافی ادھر کچھ کہہ رہا تھا زیرِ لب
واعظِ منتخب ادھر کچھ بک رہا تھا برملا

خود فروشی کا غرض تھا ہر طرف بازار گرم
ساز گوناگوں تھے لیکن ایک تھی سب کی صدا

شاعرِ مغرور بھی ایک سمت خنداں زیرِ لب
سن رہا تھا لافِ اہلِ فضل اور خاموش تھا

جا کے پہونچا جب وہاں تک دورِ صہبائے سخن
دفعتہً مجلس سے اٹھا اور ہوا یوں خودستا

دعویِ فضل و براعت اس کو زیبا ہے یہاں
جو کوئی تلمیذِ رحمٰں تم میں ہو میرے سوا

ہے تصرف میں ہمارے عرصۂ دشتِ خیال — کچھ نہیں معلوم جس کی ابتدا اور انتہا

رہروی میں ہم کو چشم و گوش پر تکیہ نہیں — ہیں ہمارے بال و پر اندیشۂ فکرِ رسا

صاف ہوتا ہے یہاں اپنا خس و خاشاک سے — پاک ہو جیسے وساوس سے دلِ اہلِ صفا

اتفاقاً گر کسی کی مدح پر آ جائیں ہم — خاطرِ دشمن میں اس کا نقشِ الفت دیں جما

خاک کو چرخِ بریں پر دیں اگر ترجیح ہم — ماند ہو ذرے کے آگے مہرِ تاباں کی ضیا

وصفِ خوباں ہم سے گر سن پائے سالک یکبیک — ہو نہ ہرگز پنجۂ عشقِ مجازی سے رہا

گر کریں ہم گل رخوں کی بے وفائی کا بیاں — ہو نہ بلبل پھر چمن میں روئے گل پر مبتلا

کھینچ دیں گر خاطرِ مشتاق کی تصویرِ شوق — قیس کی کرنی پڑے لیلےٰ کو جا کر التجا

ہیں ہماری مدح کے پیرو جواں امیدوار — اور ہماری ہجو سے تھراتے ہیں شاہ و گدا

گرمیٔ بزمِ حریفاں ہے ہماری ذات سے — بادۂ گلگوں کا ہے ہر بات میں اپنی مزا

فکر اپنی لغزشِ اہلِ نظر سے پاک ہے — ہم جہاں چلتے ہیں واں مسدود ہے راہِ خطا

کچھ نہیں اپنا ضرر گر ہو روایت میں خلل — جھوٹ سے ہوتی ہے یاں رونق عبارت کو سوا

دی نہیں گویا شریعت نے ہمیں تکلیف کچھ — جو نہیں جائز کسی کو ہے وہ سب ہم کو روا

خود ستائی جو کسی کو جز خدا پھبتی نہیں — آ کے ہو جاتی ہے شاعر کی زباں پر خوشنما

فحش اور دشنام کو ملتا ہے یاں رنگِ قبول — گالیاں دے دے کے ہم سنتے ہیں اکثر مرحبا

جب یہ بالا خوانیاں شاعر کی واعظ نے سنیں — مسکرایا اور یہ فرمایا کہ اے ہذیاں سرا!

شیوہ تیرا بو الفضولی اور یہ لاف و گزاف! — پیشہ تیرا یاوہ خوانی - اور اتنا ادعا!

امتِ برحق کے عالم ہیں جو از روئے خبر — وارثِ علمِ نبی - قائم مقامِ انبیا

کیا ادب جاتا رہا ان کا کبھی تجھ کو سفیہ! — بر سرِ مجلس ہے تو جو اس طرح پکارتا

گو نہیں گنتی میں اہلِ علم کی یہ خاکسار — پر سنے جاتے نہیں یہ تیرے دعوے ناروا

ہر سخن کا اک جدا ہوتا ہے موقع اور محل — ہزل و سخریت کجا۔ بزمِ خردمنداں کجا!

علم اور حکمت کے ہوں جس بزم میں دفتر کھلے — کس نے دی ہے تجھکو واں اس ہرزہ گوئی کی رضا
شعر مستحسن اگر ہوتا تو قرآن میں اسے — کیوں خلافِ شانِ ختم المرسلیں کہتا خدا؟
شان میں بالعلم جو دی جس کی آیا ہے صریح — فخر ہے جس شعر پر تجھکو یہ اے شر الورے!
چاہیے انفاسِ اہل الذکر سے ہو مستفید — ہو وہ جس کو علمِ سنت اور کتاب اللہ کا
خود ہو تم بے علم۔ اور صحبت سے اہلِ علم کی — بھاگتے ہو جیسے شیطاں ہے اذاں سے بھاگتا
ہے یہی باعث کہ بک اٹھتے ہو تم بے اختیار — جو تمھارے منھ میں آتا ہے سزا اور ناسزا
اس زبانِ یاوہ گو کو اپنی کیا سمجھا ہے تو؟ — رہ جو ہم گو جھوٹا ہے اسکا۔ جرم ہے لیکن ترا!
بے حقیقت ہیں ترے سارے خیالات بلند — ہاتھ ہے تو بے اثر۔ اور پوچ ہے تو بے صفا
ہے جہاں خامے کو تیرے خدمتِ مشاطگی — مورت اک پتھر کی ہے واں حورِ جنت سے سوا
بال سے باریک تر معشوق کی تیرے کمر — رات سے تاریک تر ہجرِ صنم میں دن ترا
شش جہت میں تو کرے برپا قیامت ہاتھ یار — یار سے اپنے اگر دم بھر کو ہو عاشق جدا
تیغ جو ہیں کیا ہو گر پرستش بیاں کرتی تجھے — ہے تنزل گر اسے ٹھہرائے تو تیغِ قضا
ہو جہاں لکھنی تجھے اسپِ گلی کی جست و خیز — اک تگ ورے میں اسے پہونچا دے تو فوق السما
تو جو ہجو دشنام میں جس کی سر گرم غلو — اور الٹا خوبیوں پر اس کی پردہ پڑ گیا
پر جلے درجے کا تنزل ہے اگر ٹھہرائے تو — جم کو اس کے در کا درباں اور بہمن کو گدا
بہمن و جمشیدیاں بیچارے کس گنتی میں ہیں! — ننگ ہیں ہاتھوں سے تیرے انبیا اور اولیا!
لکھے تو اک گربۂ مسکیں کو سارا منزلت — اور کہے اک بچۂ مسکیں کو تو یوسف لقا
فی المثل گر ہو ترا ممدوح اک برگ گیاہ — اس میں ثابت کرکے چھوڑے تو صفاتِ کبریا
بادخوانوں سے سوا ہو تجکو فکرِ تہنیت — خواب میں سن پائے گر تو کوسِ شادی کی صدا
ہند میں غل ڈال دے تو نالہاے شوق سے — چین میں شہرہ ہو گر اک شاہدِ نو خیز کا
شعر کو الہام سمجھے گر نصیبوں سے کبھی — کان میں پڑ جائے تیرے ایک جھوٹی واہ وا

مذہبِ شاعر میں جسکا دینِ باطل نام ہے
راستی اور صدق سے بڑھکر نہیں کوئی خطا

سر بسر اقوال تیرے کچھ ہیں اور افعال کچھ
ہے زبانِ گوہر افشاں پر نِعَم - اور دل میں لا

شان میں آیا ہے جن کی قول مالا یفعلون
چشم بد دور آپ کے ہادی ہیں وہ اور مقتدا

ایسے دروازے بہت کم پائیں گے آفاق میں
جس پہ صبح و شام تو نے دی نہ ہو جا کر صدا

ہے زبانِ خامہ تیری تابعِ فرمانِ حرص
کام تجکو کچھ نہیں جز مدح و قدح اغنیا

مدح میں حد سے زیادہ جن کی کرتا ہے غلو
گالیاں دیتا ہے تو اکثر انھیں کو برملا

جیسے دروازوں سے پھرتے ہیں دعا دیکر فقیر
مدح تو بھی ختم کرتا ہے یونہیں دے کر دعا

ہر دعا میں ہے مقدر شر ما انّ اعطیتنی
صاف لعنت کا دعا میں تیری آتا ہے مزا

پر وہ عرضِ ہنر میں مانگتا ہے بھیک تو
گر یہی ہے شاعری تو اس سے بہتر ہے گدا"

زہر دل کا جب کہ واعظ نے لیا سارا اگل
اور نہ کوئی تیر باقی اس کے ترکش میں رہا

حسن کے شاعر نے کہا دل بس ہے خدا لگتا انداز بس!
ہے زباں تیری دہن میں یا سنانِ جاں گزا؟

چوٹ تھی تیری سخن پر - جا پڑی اخلاق پر
تو نے چاکِ پیرہن کو تا جگر پہونچا دیا

خردہ گیری کے لئے حاضر ہے شاعر کا کلام
اس سے کیا مطلب - کہ ہے وہ بندۂ حرص و ہوا

تو اگر معصوم ہو تو کچھ کہی جاتی نہیں
پھنس رہا ہے ورنہ اس پھندے میں ہر شاہ و گدا!

کھیلتے پھرتے ہیں میدانِ جہاں میں سب شکار
آڑ میں ٹٹی کی لاکھوں اور ہزاروں برملا

حرص ہوتی جسم میں انساں کے گر جاے خوں
شاعروں سے تیرے چہرے کی رنگت ہوتی سوا

میں نے ان آنکھوں سے اے واعظ لیا [illegible]
جو فروشی کرتے دیکھے ہیں بہت گندم نما

چھوڑ ہے اک تم کو - کہہ دوں گر برا مانو نہ تم
آپ ہو بیمار اور اوروں کو دیتے ہو دوا

آپ میں تسبیح و ذکر و طاعت و زہد و ورع
خوبیاں سب کچھ سہی پر دل کا مالک ہے خدا

میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
جو ہیں خود اچھے وہ اوروں کو نہیں کہتے برا

بات حق ہو یا کہ باطل تیری مرضی کے خلاف
منہ سے نکلی اور تجھے تکفیر کا پہلو ملا

ترکِ اولےٰ پہ فضیحت جس قدر کرتا ہے تو
قتلِ انساں پر نہیں ملتی کہیں ایسی سزا

ہے فقط دوزخ تیری سرکار میں جنت نہیں
چوک جس سے ہو گئی کچھ پھر نہیں تو بخشتا

عاصیوں کی مغفرت جس سے نکلتی ہے صریح
ایسی آیات اور حدیثوں سے ہے تو جی میں خفا

گر خدا بھی واعظو! ہوتا تمہیں سا سخت گیر
اس چمن کو دیکھتا کوئی نہ پھر پھولا پھلا

گرم بازاری اِسی میں اپنی بس سمجھے ہو تم
لوگ ہوں بدراہ اور اُن کے بنو تم رہنما

چاہتے ہو تم یہاں کثرتِ معاصی کی یونہیں
ہیں اطبا چاہتے جس طرح امراض اور وبا

آپ اِن باتوں کو اِک بہتان سمجھیں گے مگر
سوجھتی اکثر نہیں انساں کو اپنی خطا

جو کہوں میں اُس کو باور کر نہیں اس میں خلاف
شاعروں کے کذب سے بدتر ہے واعظ کی ریا

یہ بھی کوئی جھوٹ ہے ہم جس کے خود ہیں معترف؟
جھوٹ وہ ہے جو ہو پردے میں تقدس کے چھپا

دعوتوں میں سچ بتا۔ جس شوق سے جاتا ہے تو
ایک بھی کی ہے نماز اُس شوق سے تونے ادا؟

یاد ہے وہ تیرا کہنا دیکھ کر کھانے سچے ؛
"دین قائم ہے ابھی یارو کرو شکرِ خدا"

مدرسے کوشش سے تیری گو بنے ہیں شہر شہر
مسجدیں بھی تونے بنوائی ہیں اکثر جا بجا

پر یہ حیرت ہے کہ اِن کاموں میں جو لاگت لگی
اُس سے وہ چند آپ کے دیوان خانہ میں لگا

مجرموں کے جرم شاید ہوں نہ اتنے خوفناک
نیکیاں تیری ہیں جتنی پُرخطر روزِ جزا

ہے یقیں اتنا ہی ہوگا اپنے دل میں تو حقیر
جس قدر مانا ہے زید و عمر نے تجکو بڑا

کردیا رسوا تری تردید نے تزکیہ کو
ورنہ اِک منصب تھا یہ شایانِ شانِ انبیا

لطف ہے تو دلربا۔ اور قہر ہے تو دل فریب
سحر ہے، افسوں ہے، جادو ہے، تری جو ہے ادا

گہ جہنم سے ڈرا کر چاہتا رشوت ہے تو
گاہ حوروں پر لبھا کر مانگتا ہے رونما

گو بجھتا ممبر پہ ہے یوں بیٹھکر گویا کہ آپ
آسماں سے لے کے اُترے ہیں ابھی حکمِ خدا

ہاتھ میں تیرے ہے گویا نار و جنت کی کلید
جس نے پوجا تجھ کو وہ فردوس میں داخل ہوا

نیکیاں برباد ہیں ساری تری خدمت بغیر
فرقۂ ناجی ہے بس اک پوجنے والا ترا

اپنی اک امت الگ سب سے بنانے کے لیے
تفرقے ڈالے ہیں دین حق میں تو نے جا بجا

تیرے گھر سے ہیں مسلمانوں میں جب تک نزاع
اختلاف امت کا حق میں تیرے رحمت ہو گیا

جس طرح جھگڑوں کے خواہاں ہیں عدالت میں وکیل
مانگتا ہے تو یونہیں باہم خصومت کی دعا

چاہتا ہے قوم میں جوتی سدا چلتی رہے
کشتیٔ اسلام کا پھر کیوں نہ ہو تو ناخدا؟

شاعروں کو بس اسی منہ سے گدا کہتا ہے تو؟
اے اسیر دام نفس! اے بندۂ حرص و ہوا!

کچھ گدا کہنے سے تیرے ہم گدا ہوتے نہیں
ورنہ ہم بھی یوں تو کہہ سکتے ہیں بعضوں کو گدا

شاعری پر ہے بڑا یہ طعن حضرت کا کہ ہم
حد سے بڑھ جاتے ہیں جب کرتے ہیں مدح اغنیا

طعن کچھ بیجا نہیں۔ رکھتے ہیں پر اک عذر ہم
غور کرنا عذر پر ہے شیوۂ اہل صفا

سب پہ روشن ہے۔ کہ ہم لوگوں کا اک پیشہ ہے مدح
جیسے تم لوگوں کا پیشہ ہے یہی مکر و ریا

اپنے اپنے کام اور پیشے میں ہم ہوں یا کہ تم
کرتے ہیں ہوتا ہے جو کچھ مصلحت کا مقتضا

وعظ میں دیتے ہو آخر داستاں کی چاٹ تم
راستی سے کام جب چلتا نہیں تسخیر کا

مدح میں ہم بھی یونہیں کرتے ہیں رنگ آمیزیاں
جب تن ممدوح پر کھلتی نہیں سادی قبا

پھول پھل سے سرو کو بے بہرہ جب پاتے ہیں ہم
ایک طرہ اس میں آزادی کا دیتے ہیں لگا

سوسن و نسرین و گل میں جب وفا پاتے نہیں
وصف رنگ و بو سے ہم دیتے ہیں عیب انکا چھپا

پر ہم اس پردے میں خود اپنا دکھاتے ہیں کمال
ورنہ ایسی مدح ہے ممدوح کے حق میں ہجا

اس سے بڑھ کر ہجو ہو سکتی ہے کیا انسان کی؟
کہتے ہیں اعمےٰ کو بینا اور راہزن کو رہنما

عادل ان کو لکھتے ہیں ہم نوشیروان عہد انہیں
ایک منکوحہ کا حق ہوتا نہیں جن سے ادا

حاتم وقت انکو ٹھہراتے ہیں جن کا بذل و جود
اس قدر ہے تاکہ حاصل حاکموں کی ہو رضا

زیرکی میں ان کو کہتے ہیں ارسطوئے زماں
ہنستے ہیں احمق بناتے ہیں جنہیں صبح و مسا

کہتے ہیں کس سادہ دلی سے ہم انھیں بیدار مغز
جو نہیں واقف کہ آمد کیا ہے اور ہے خرچ کیا

جو سدا مانند خوشامد کرتے ہیں حکام کی
ان کی آزادی پہ ہم کہتے ہیں شو شو مرحبا

اُن میں ثابت کرتے ہیں ہمدردیِ نوعِ بشر
آپ کو کہتے ہیں جو نوعِ بشر سے کاوری

حامیِ اسلام دیتے ہیں خطاب اُن کو کہ جو
کرتے ہیں رسوا چلن سے اپنے نام اسلام کا

یاوہ گو، حلق اُن کو کہتے ہیں جنھیں اے واعظو!
تم کسی کے کام کا کہتے نہیں اپنے سوا

ہجو کی جاتی ہے یاں اکثر اسی انداز سے
شیخ ہو ممدوح یا واعظ غنی ہو یا گدا

قطبِ دوراں اُن ریاکاروں کو ٹھہراتے ہیں ہم
آپ کو بھی جو سکھاتے ہیں مدّتوں مکر و دغا

اُن فسوں سازوں کو ہم کہتے ہیں ذوالنونِ زماں
بیٹھ کر ممبر پہ جو آنکھوں کا کاجل لیں اُڑا

آپ چھٹ اس کو کہے جو مدح وہ بے مغز ہے
نام اس کا مدح ہے تو ہجو ہے پھر چیز کیا؟

پھبتی اور دکھتی سخنور نے یہ کی تقریر جب
اور لگے سب مسکرانے دیکھ کر یہ ماجرا

دل میں واعظ نے پڑھی لاحول اور سمجھا کہ میں
چھیڑ کر اک بے ادب کو مفت میں رسوا ہوا

پر بظاہر داغ یہ دامن سے دھونے کے لیے
ہنس کے اک سنجیدگی سے اور متانت سے کہا

ہو چکیں باتیں ہنسی کی اب کرو کچھ اور ذکر
ہزل و استہزا زیادہ حد سے ہوتا ہے بُرا

کہئے فکرِ شعر کا ہوتا ہے اب بھی اتفاق
آپ نے دیوان مرتّب کیوں نہیں اب تک کیا؟

ہیں ہنسی کی اور باتیں کیجئے انصاف اگر
ہر غزل میں آپ کے دیوانِ حافظ کا مزا"

عرض کی شاعر نے "حضرت کا ہے یہ سب حسنِ ظن
ورنہ میں کیا اور مرا مجموعۂ اشعار کیا؟

قبلہ! اب وہ دن گئے جو شاعری کی قدر تھی
شاعری اور نکتہ پردازی میں ہے اب کیا دھرا؟

شعر اگر کہئے تو روٹی جا کے کس گھر کھائیے؟
سیکڑوں پھرتے ہیں شاعر تنگدست اور بے نوا

اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر
وعظ میں شاگرد ہو جاؤں کسی استاد کا

اس گئے گذرے زمانے میں بھی یہ فنِ شریف
کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا

آپ لوگوں کی تو اس میں ریس کرنی ہے محال
پر ہمیں بھی سیکھنے سے کچھ نہ کچھ آ جائے گا

روز گر سونے کی چڑیا گو نہ ہاتھ آئی نہ آئے
ہم گنہگاروں کا پیٹ ایسا نہیں ہے کچھ بڑا"

کی سخن پرواز نے واعظ سے جب یہ گفتگو
قہقہوں سے چار سو مجلس میں اک غل پڑ گیا

خواب کا سا وہ سماں جاتا رہا سب یک بیک　　اور دی پہلو سے دل نے کان میں میرے صدا
ہر دل ہو یا جِد نصیحت لیجئے ہر بات سے　　کہہ گئے ہیں اہلِ دل دَعْ مَا کَدِرْ خُذْ مَا صَفَا

رُباعیات

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا　　حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجکو جانا ہے ضرور　　بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

۲

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

۳

مٹی سے ہوا سے آتش و آب سے یاں　　کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک　　گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں

۴

کیا ہو گی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد؟　　دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر جو کہ ہیں تجھ سے لو لگائے بیٹھے　　رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

۵

ممکن ہی نہیں کہ ہو بشر عیب سے دور　　پر عیب سے بچیئے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر۔ خبردار رہو　　گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

۶

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو　　رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا　　ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

۷

اے علم! کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال — غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
ان پہ ہوئے غیب کے خزانے مفتوح — جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

۸

ہیں یار رفیق - پر مصیبت میں نہیں — ساتھی ہیں عزیز - لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انسان سے توقع ہے عبث — جو نوعِ بشر کی خود جبلت میں نہیں

۹

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے — ہر قہقہہ پیغامِ بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں — کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

۱۰

منزل ہے بعید - باندھ لو زادِ سفر — مواج ہے بحر - رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے - لے چلو مال کھرا — ہلکا کرو بوجھ - ہے کٹھن راہگذر

۱۱

اے وقت! بگاڑ کا ہے سب کے چارہ — پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی — پھر غم نہیں - پھر جائے زمانہ سارا

۱۲

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر — انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اٹھا چکے - اب حالی — مجلس کرو برخاست - ہوا وقتِ سحر

۱۳

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال — مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی — اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

۱۴

احساں کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو ۔۔۔ تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو گر احساں تو کرو اُسے عام ۔۔۔ اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنوں نہ ہو

۱۵

یاد اُس کی یہاں وِرد مدام اپنا ہے ۔۔۔ خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجئے کہ ہے نام اُس کا! ۔۔۔ کس طرح نہ کیجئے کہ کام اپنا ہے

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی

۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ وطن مالوف آپ کا سیالکوٹ ہے۔ لاہور کالج میں تعلیم پاکر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ابتدا سے سن تمیز سے طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ فن سخن کا صحیح مذاق سخن آفریں نے آپ کی طبیعت میں ودیعت کیا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں آپ نے نالۂ یتیم کے عنوان سے ایک قابل قدر نظم پڑھی۔ یہ نظم دل گداز اور موثر ہونے کی وجہ سے کچھ ایسی مقبول خاص و عام ہوئی کہ یتیم خانے کے لئے چندے کی بارش ہونے لگی۔ اسی نظم نے اس شہرت کی بنیاد رکھ دی۔ جو آپ اطراف ہند میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ عربی اور فارسی میں بھی قابلیت رکھتے ہیں۔ اور سنسکرت سے بھی آشنا ہیں آپ کے کلام میں بھرتی کے شعر کم پائے جاتے ہیں۔ کوئی شعر درد۔ وحدت اخلاق کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتا۔ مولانا شبلی فرماتے تھے کہ "جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی۔ تو لوگ آپ کو ڈھونڈھیں گے" آپ کو تلمذ اگرچہ حضرت داغ سے رہا ہے۔ مگر مشکل پسند طبیعت کے اقتضا سے مرزا غالب کی پیروی کرتے ہیں۔

شب و شاعر

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں — خاموش صورتِ گل مانندِ بو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو — مچھلی ہے کوئی میری دریائے نور کی تو
یا تو مرے جبیں کا تارا گرا ہوا ہے — رفعت کو چھوڑ کر جو بستی میں جا بسا ہے
خاموش ہو گئے ہیں تارِ ربابِ ہستی — ہے میرے آئینہ میں تصویرِ خوابِ ہستی
دریا کی تہ میں چشمِ گرداب سو رہی ہے — ساحل سے لگ کے موجِ بیتاب سو گئی ہے
بستی زمین کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے — یوں سو گئی ہے جیسے آباد ہی نہیں ہے

شاعر کا دل ہے لیکن نا آشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا تو کیونکر مرے فسوں سے

میں تیری چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں — چھپ کے انسانوں سے مانندِ سحر روتا ہوں
دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں — عزلتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں
مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو — تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو
برقِ ایمن مرے سینہ میں پڑی روتی ہے — دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے
صفتِ شمعِ لحد مردہ ہے محفل میری — آہ اے رات بڑی دور ہے منزل تیری
عہدِ حاضر کی ہوا راست نہیں ہے اس کو — ابھی نقصان کا احساس نہیں ہے اسکو

ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں
(اقبال)

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھکو — مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھکو؟

متاع نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھکو — ہے کیا ہراس فنا صورت شرر تجھکو؟
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھکو — مثال ماہ اڑھائی قبائے زر تجھکو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے — تمام رات تری کانپتے گذرتی ہے
چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے — جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر — فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداع غنچہ میں ہے راز آفرینش گل — عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ترانہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھکو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں — معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھوٹ کی کر۔ مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس پس بھری ہوا نے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ دل کے غیریت کے پردوں کو پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں۔ نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے جی کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اس ہردوار دل میں لاکر جسے بٹھا دیں

سندر ہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں

زنّار ہو گلے میں۔ تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا
ہر آتما کو گویا اک آگ سے لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اس سے پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں

ہندوستاں لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں کو ناقوس میں چھپا دیں

اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا۔ ستم اٹھانا۔ اور ان کو پیار کرنا

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو؟

شورش سے ہوں گریزاں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کے چلنے والے رہ جائیں تھک کے جسدم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

پچھلے پہر کو کوئل وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احسان
روزن ہی جھونپڑے کا مجھکو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ مرا دعا ہو

دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو
سرسبز جس کی نم سے بوٹا امید کا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

راز ہستی

زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے دم کے سوا کچھ بھی نہیں

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

آنسوؤں کی سبحہ گردانی سے ہے پیری میں کام
صبح کے دامن میں شبنم کے سوا کچھ بھی نہیں

زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

(اقبال)

خان بہادر سیّد اکبر حسین رضوی

اکبرؔ تخلص - اکبر حسین نام - الہ آباد کے رہنے والے - منشی غلام حسین صاحب وحیدؔ الہ آبادی (شاگرد خواجہ آتشؔ) کے شاگرد رشید - بلکہ سرمایۂ ناز اور فخرِ استاد تھے - عربی فارسی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے - اور زبانِ انگریزی اور اُس کے علم ادب سے بخوبی ماہر تھے - مغربی خیالات کو بطرز احسن ایشیائی لباس پہنانے میں ساعی رہتے تھے - اور عمدہ طور پہ کامیاب بھی ہوتے تھے اکثر مشاہیر انگلستان کے کلام کا اُردو میں بہت ہی خوش اسلوبی اور عمدگی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ایشیائی طرز قدیم میں بھی بہت بلند پایہ ناظم و شاعر تھے - قوّت متخیّلہ و ممیّزہ دونوں میں اعلیٰ درجے کا حصّہ فطرتاً آپ کی طبیعت میں ودیعت ہوا ہے - چنانچہ تعلیم و تہذیب مغربی کا جو روز افزوں اثر ہمارے ہندوستانی نوجوانوں پہ ہو رہا ہے - اور اُس سے جو نتیجے پیدا ہوئے - اور ہو رہے ہیں - اُن کے متعلق آپ اکثر نہایت قابلِ قدر خیالات ظاہر فرماتے رہتے تھے - زبان نہایت صاف اور پاکیزہ اور طرز بیان بیحد دلچسپ و دلکش ہے - نغز گوئی اور بذلہ سنجی آپ کی شوخ طبیعت کا ایک ادنےٰ جوہر ہے - مگر ساتھ ہی مضمون آفرینی اور نازک خیالی سے خالی نہیں - عاشقانہ رنگ کے شعر میں بات پیدا کرنی اِن کی جدّت پسند طبیعت کا ایک خاص مذاق ہے - کلام میں صفائی و سادگی اپنے اپنے محل و موقعہ پہ دل آویز جھلک دکھاتی ہیں - الغرض آپ کا کلام برگزیدہ و پسندیدۂ خاص و عام ہے - عیوب شاعری سے مبرّا و نقائص سے سراسر معرّا ہے - ہر رنگ - ہر بحر - ہر زمین میں کامل دسترس تھی پولیٹکل اور سوشل معاملات میں آپ کی رائے نہایت متین و مناسب ہوتی تھی - خیالات بھی نہایت سُلجھے ہوئے اور اکثر اچھوتے ہیں اپنے طرزِ خاص میں مسلّم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں - آپ کے تین دیوان مُرتّب

ہوگئے ہیں۔ جو چھپکر شائع ہوچکے ہیں۔ چوتھا بھی شروع ہوچکا تھا کہ اس جہان فانی سے آپ نے رحلت فرمائی۔

آپ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ دینی مکاتب اور سرکاری مدرسوں میں تعلیم پاکر ۱۸۶۶ء میں امتحان وکالت درجۂ ادنےٰ پاس کیا ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کے مسل خواں مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں وکالت درجۂ اعلیٰ کی سند حاصل کرکے ۱۸۸۰ء تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں دوبارہ سرکاری ملازمت کی۔ منصفی سے درجہ بدرجہ ترقی کرکے ۱۸۸۸ء میں سب جج اور ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ درجۂ اوّل۔ اور سشن جج مقرر ہوئے۔ اور کئی سال تک ہزار بارہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پاتے رہے۔ ۱۹۰۳ء میں اپنے مستقل عہدہ ججی عدالت خفیفہ الہ آباد سے نہایت نیک نامی کے ساتھ پنشن لے کر علحدہ ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ نے جوڈیشل سروس کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہوئے۔

حضرت اکبر موجودہ عہد کے اُن منتخب شعرائے اردو میں سمجھے جاتے تھے جنھوں نے زمانہ کے میلانِ عام اور جدید اثرات سے متأثر ہوکر شاعری کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ ان کے کلام میں سنجیدہ اور نتیجہ خیز ظرافت کی آمیزش ایک ایسا دلکش حسن ہے۔ جو ان کو اپنے تمام معاصروں میں نمایاں کرتا ہے۔

غزلیات

کہو کرے گا حفاظت مری خدا میرا — رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا؟
خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ — تو ذرّہ ذرّہ عالم ہے آشنا میرا؟
مری حقیقتِ ہستی یہ مشتِ خاک نہیں — بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا

اُنھیں ہے عقل جو محتاجِ غیر ہیں ہر دم
مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدّعا میرا

غرور اُنھیں ہے تو مجھکو بھی ناز ہے اکبر
سوا خدا کے سب اُن کا ہے اور خدا میرا

۲

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

اس نے خدا کو مانا وہ ہو رہا بتوں کا
یا اس نے خوب سمجھا یا اُسنے خوب دیکھا

نامِ خدا کو اکثر زیبِ زباں تو پایا
عشقِ بتاں کو لیکن نقشِ قلوب دیکھا

اوروں پہ معترض تھے لیکن جو آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنجِ عیوب دیکھا

۳

جو مل گیا - وہ کھانا - داتا کا نام جپنا
اس کے سوا بتاؤں کیا تم سے کام اپنا

رونا تو ہے اسی کا کوئی نہیں ہے اپنا
دنیا ہے اور مطلب مطلب ہے اور اپنا

اے برہمن ! ہمارا تیرا ہے ایک عالم
ہم خواب دیکھتے ہیں تو دیکھتا ہے سپنا

یہ دھوم دھام کیسی ؟ شوقِ نمود کیسا ؟
تجلی کو دل کی خلوت آتا نہیں تڑپنا

بے عشق کے جوانی کٹنی نہیں مناسب
کیونکر کہوں کہ اچھا ہے جیٹھ کا نہ تپنا

۴

لے گیا تھا طرفِ گورِ غریباں دلِ زار
کیا کہیں تم سے جو کچھ واں کا تماشا دیکھا

وہ جو تھے رونقِ آبادیِ گلزارِ جہاں
سر سے پا تک انھیں خاکِ رہِ صحرا دیکھا

کل تلک محفلِ عشرت میں جو تھے صدر نشیں
قبر میں آج انھیں بے کس و تنہا دیکھا

بس کہ نیرنگیِ عالم پہ اُسے حیرت تھی
آئینہ خاکِ سکندر کو سراپا دیکھا

سرِ جمشید کے کاسے میں بھری تھی حسرت
یاس کو معتکفِ تربتِ دارا دیکھا

۵

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات — خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا
رنجِ دُنیا سے بہت مضطرب الحال تھا یہ — دل میں تسکیں ہوئی مذہب کے اثر سے پیدا

٦

سب سے کر قطعِ نظر، پھر خیالِ رُوئے دوست — یاں ہر اِک شے کو سمجھ عکسِ جمالِ رُوئے دوست
گوشِ عارف کے لئے قائم ہے صَوتِ سرمدی — ذرّہ ذرّہ کہہ رہا ہے اُس سے حالِ رُوئے دوست
گردشِ ارض و سما ہے خضرِ راہِ معرفت — مہر و مہ ہیں شاہدِ اَوجِ کمالِ رُوئے دوست

٧

شورِ بلبل - جوشِ گُل - موجِ نسیم - انوارِ صبح — اللہ اللہ کس قدر ہیں دل کشا آثارِ صبح
آفتابِ اوجِ سعادت کا ہے وہ روشن نفس — نورِ طاعت جس سے ظاہر ہو دمِ آثارِ صبح
جلوۂ حق کے مقابل رُوئے بُت ہے بے فروغ — ہے پیامِ مرگ شمعوں کے لئے دیدارِ صبح
واہ کیا کہنا ہے تیرا اے نسیمِ صبح خیز! — تیرے دَم سے ہے چمن میں گرمیِ بازارِ صبح
عاشقِ دنیا کو کیوں آئے خیالِ آخرت؟ — کس نے پروانے کو پایا شائقِ دیدارِ صبح
عہدِ پیری آگیا اکبر سنبھالو اپنے ہوش — خوابِ غفلت سے اُٹھو پیدا ہوئے آثارِ صبح

٨

بہار آئی کھِلے گُل زیبِ صحنِ بوستاں ہوکر — عنادل نے مچائی دھوم سرگرمِ فغاں ہوکر
بچھا فرشِ زمرّد اہتمامِ سبزۂ تر میں — چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہوکر
عروجِ نشو و نما سے ڈالیاں جھُومیں — ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہوکر
بلائیں شاخِ گُل کی لیں نسیمِ صبحگاہی نے — ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگینِ بتاں ہوکر
جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا — کسی نے یاسمن ہوکر کسی نے ارغواں ہوکر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں — صدائے نغمۂ بلبل اُٹھی بانگِ اذاں ہوکر
ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو — ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہوکر

زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں — خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر
نگاہیں کاملوں کی پڑ ہی جاتی ہیں زمانے میں — کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

٩

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں — ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں
معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے — شہرِ تن میں جب کہ خود اپنا پتا ملتا نہیں
غافلوں کے لطف کو کافی ہے دنیاوی خوشی — عاقلوں کو بے غمِ عقبیٰ مزا ملتا نہیں
کشتیِ دل کی الٰہی! بحرِ ہستی میں ہو خیر! — ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں
غافلوں کو کیا سناؤں داستانِ عشقِ یار؟ — سننے والے ملتے ہیں درد آشنا ملتا نہیں
زندگانی کا مزا ملتا تھا جن کی بزم میں — اُن کی قبروں کا بھی اب مجھکو پتا ملتا نہیں
صرف ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا — کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں
پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر — کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں
شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی — بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

١٠

نہیں جمتا کسی کا نقش اس دنیائے فانی میں — حباب آسا مٹا، اُبھرا جو بحرِ زندگانی میں
سکونِ قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں — بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے اور وہ بھی جوانی میں
اجل کی نیند آ جاتی ہے آخر سننے والوں کو — قیامت کا اثر پاتا ہوں دنیا کی کہانی میں
حباب اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہوا گذرا — تماشا تھا ہوا نے اک گرہ دے دی تھی پانی میں
نہ پوچھو اے ہم نفس! وہ قصۂ عیش و طرب ہم سے — کسے اب یاد ہے اک خواب دیکھا تھا جوانی میں؟
اُسی صورت میں دلکش خوبیِ الفاظ ہوتی ہے — کہ حسنِ یار کا پیدا کرے جلوہ معانی میں
زبانِ حال سے پروانۂ بسمل یہ کہتا ہے — حضوری ہو اگر حاصل مزا ہے نیم جانی میں
فلک نے مضمحل کر کے ہمیں خس کر دیا آخر — بہے جاتے ہیں بے مقصود بحرِ زندگانی میں

ادب سے شکر کرکے احتراز اولیٰ ہے اے اکبر ہزاروں آفتیں شامل ہیں اُن کی مہربانی میں

۱۱

ختم کیا صبا نے رقص، گُل پہ نثار ہو چکی جوشِ نشاط ہو چکا، صَوتِ ہزار ہو چکی
رنگِ بلائے زمانہ کو دیکھ کے گُل نے راہ لی لطفِ نسیم ہو چکا، کاوشِ خار ہو چکی
رنگِ بنفشہ مٹ گیا، سنبلِ تر نہیں رہا صحنِ چمن میں زینتِ نقش و نگار ہو چکی
مستیٔ لالہ اب کہاں، وہ اُس کا پیالہ اب کہاں؟ دورِ طرب گزر چکا، آمدِ یار ہو چکی
رُت وہ جو تھی بدل گئی، آئی بس اور نکل گئی تھی جو ہوا میں نکہتِ مشکِ تتار ہو چکی
اب ہم تو اسی روش پہ ہے اکبرِ مست و بے خبر کہہ دے کوئی عزیز من فصلِ بہار ہو چکی

۱۲

دلوں کو لذتِ معنی کا اب حس بھی نہیں باقی جسے دیکھو قتیلِ صورتِ دنیائے فانی ہے
حدیثِ آرزوئے قربِ باری ہے نظر کس کی؟ خدا اک لفظ ہے اور شوقِ موسیٰ اک کہانی ہے
ہوائے وادیٔ ایمن کہاں اب گلشنِ دل میں! نہ وہ ارنی کا نعرہ ہے نہ شوقِ لن ترانی ہے
معاذ اللہ غفلت باریاں یہ ابرِ عصیاں کی! کوئی آلودۂ آز کوئی مصروفِ خیالی ہے
بٹھا دے اپنی مستی اشتیاقِ حسنِ فانی میں ہوا اے اکبر تجھے ذوقِ حیاتِ جاودانی ہے

۱۳

دلِ مبتلائے غفلت تو ہے محوِ بدگمانی جو خدا کی یاد آئے تو اُسی کی مہربانی
جو گزر گیا خودی سے تو وہ بن گیا اسی سے نہ ہوا ہے رتبۂ ازلی نہ صدائے لن ترانی
نہیں زباں پہ لاؤں کیونکر وہ حدیثِ حسنِ پنہانی؟ کہ نہ بار لفظ اٹھائے گی نزاکتِ معانی
نہیں تجھے گیا وہی ہے عمر سے پردۂ نفس ہی مجھے اب تو سانس لینا ہی ہے لطفِ زندگانی

رباعیات

کھولی ہے زبان خوش بیانی کے لئے اٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے

آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر — نظارۂ شاہدِ معانی کے لئے

۲

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا؟ — غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن — کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

۳

انقلابِ جہاں کو دیکھ لیا — حُبِّ دنیا سے قلب پاک ہوا
کل کلی کھل کے ہو گئی تھی پھول — پھول کمھلا کے آج خاک ہوا

۴

لا مذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم — ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
کعبے سے بُت نکال دیے تھے رسول نے — اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

۵

پیری آئی ہوئی جوانی رخصت — ساتھ اس کے وہ لطفِ زندگانی رخصت
ہے اب تو اسی کا انتظار اے اکبر — ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

۶

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد — افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی — حضرتؐ کا تصوّر اور اللہ کی یاد

۷

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش — ذلّت ہے در اصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبر تو سرورِ طبع کو علم میں ڈھونڈھ — محنت میں کر سکوں راحت کی تلاش

۸

بے غیرت و خود فروش و جاہل سے نہ مل — حق سے جو ہو غافل ایسے غافل سے نہ مل

یکجا کردیں حوادثِ دہر اگر — جائز ہے کہ اُن سے مل۔ مگر دل سے نہ مل

٩

اِس بزم سے سب کے سب اُٹھے جاتے ہیں — تسکین کے جو تھے سبب اُٹھے جاتے ہیں
اِک قوتِ مذہبی عقیدوں سے تھی — وہ بھی تو دلوں سے اب اُٹھے جاتے ہیں

١٠

اگر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں — بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
اگر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار — مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

١١

ہے صبر و قناعت اِک بڑی چیز اکبر — لذت ابھی اِس کی تو نے چکھی ہے کہاں؟
دُنیا طلبی کے وعظ میں محو ہے تو — یہ بھی تو ذرا سمجھ کہ رکھی ہے کہاں؟

١٢

خاطر مضبوط دل توانا رکھو — اُمید اچھی خیال اچھا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمھاری آساں — اکبر اللہ پر بھروسا رکھو

١٣

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو — اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
قربت سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر — بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

١٤

اللہ کا صدقِ دل سے جو طالب ہو — حیرت نہیں گر ملک کا ہم غالب ہو
ہرگز نہ بڑھیں گے اُس سے شیخ کے مرید — ممکن نہیں جسم روح پر غالب ہو

١٥

جس بات میں تم شکستِ ملت سمجھو — اُس میں شرکت کو اپنی ذلت سمجھو

جو بندۂ نفس ہو مخالف اُس کا
قومی غیرت کی اُس میں قلت سمجھو

١٦

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بُری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اِس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

١٧

دُنیائے دَنی کی اب ہوس جانے دو
گلچیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ
اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

١٨

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی
"اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو"
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

١٩

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی
اور ذکرِ خدا سے جس نے راحت پائی
کوئی نہیں خوش نصیب اُس سے بڑھکر
بس دونوں جہاں کی اُس نے نعمت پائی

٢٠

خواہش ہے تجھے اگر غنی بننے کی
دَولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے بندے!
کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی